کے ضمن میں رقم کیا گیا۔

نثری کارنامے: سرسید کی تصنیفوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔ ان کی پہلی کتاب 1840ء میں "جام جم" کے نام سے فارسی زبان میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد "آثار الصنادید" شائع ہوئی۔ غدر 1857ء کے بارے میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا۔ جس میں مسلمانوں کو بری الذمہ قرار دیا گیا۔ اس کے بعد رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس کے علاوہ وہ خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن اور مجموعہ لیکچر بھی ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو نثر میں سرسید پہلے فرد ہیں جنہوں نے تاریخی، تحقیقی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی، اقتصادی اور اصلاحی مضامین کو عبارت فن کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلوب تحریر: سرسید احمد خان بہت بڑی شخصیت اور کردار کے مالک تھے۔ ان کی ساری زندگی قوم کی اصلاح اور خدمت ہے۔ دنیا کے تمام بڑے آدمیوں کی طرح ان کے اندر بھی مقناطیسی کشش تھی۔ جو شدید مخالفوں کے باوجود لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتی تھی وہ ایک زبردست مصنف، بلند خیال، مفکر، جلیل القدر، مصلح اور جوش اعتقاد رکھتے تھے۔

سرسید کا طرز تحریر سادہ واضح اور پُر زور تھا۔ انہوں نے اپنی ضمیر کی باتوں کو طریقے سے دوستوں تک پہنچایا۔ سرسید احمد خان نے کام کی باتیں کام کی زبان میں لکھنی سکھائیں۔ قوت بیانی نے سرسید کو دوسرے اصحاب سے ممتاز کرتی ہیں۔ سرسید کی انشاء ہمواری بے مثال ہے۔ اسلوب بیان اور زبان میں سلاست اور روانی، عبارت میں دلکشی اور تحقیقی الفاظ میں تراش خراش پائی جاتی ہے۔ اصلاحی کاموں کے علاوہ اردو زبان اور ادب پر بھی سرسید کا مستقل احسان ہے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو نثر میں مضامین کو سادگی و متانت کے ساتھ شروع کیا ہے۔

سرسید کی عبارت عام طور پر تشبیہات، استعارات، صنائع اور بدائع سے پاک ہے۔ کہیں کہیں بذلہ گوئی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ مختصر اور موقع کی تصویر الفاظ میں نہایت خوبی کے ساتھ کھینچی ہے۔ البتہ کسی کسی جگہ عبارت بے لطف اور ناہموار ہے۔

عبارت کہیں کہیں گلابی اردو کا مزہ دیتی ہے۔ جوش اصلاح اور اظہار خیال میں سرسید نے آزادانہ طور پر کام کیا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے اجراء سے سرسید نے اردو زبان و ادب کے لیے سلیس اور عام فہم اردو کا ذخیرہ جمع کر دیا۔ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے۔ سچائی، بے باکی، سادگی، شوخی بیان اور برمحل استعمال سرسید کی تحریر کے خاص جوہر ہیں۔ قوم اور ملک کے علاوہ وہ اردو زبان و ادب پر سرسید کے بے شمار احسانات ہیں۔

☆☆☆

یونٹ: ۵

معروضی سوالات

۱۔ نظیر اکبرآبادی کا نام کیا تھا؟

۱۔ ولی خان　　۲۔ ولی محمد

۳۔ ولی اللہ　　۴۔ وصی اللہ

۲۔ نظیر اکبرآبادی کہاں پیدا ہوئے؟

۱۔ بنارس میں　　۲۔ ولی محمد

۳۔ دلی میں　　۴۔ بریلی میں

۳۔ نظیر اکبرآبادی کب پیدا ہوئے؟

۱۔ 1733ء　　۲۔ 1735ء

۳۔ 1730ء　　۴۔ 1739ء

۴۔ نظیر اکبرآبادی کی وفات کہاں ہوئی؟

۱۔ بریلی　　۲۔ دلی

۳۔ بدایوں　　۴۔ اکبرآباد آگرہ

۵۔ نظیر اکبرآبادی کی وفات کب ہوئی؟

۱۔ 1830ء　　۲۔ 1820ء

۳۔ 1826ء　　۴۔ 1825ء

جس میں شیخ صاحب کی پارٹی نیشنل کانفرنس کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ آپ پھر وزیر اعلیٰ چنے گئے اور 7 ستمبر 1982ء تک ریاست کے وزیر اعلیٰ رہے۔ 8 ستمبر 1982ء کو شام کے ساڑھے چھ بجے دل کا دورہ پڑنے سے آپ نے اس دنیا کو خیرباد کہا اور راہی ملک عدم ہو کر ابدی نیند سو گئے۔ آپ کی وفات پر ملک بھر میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں ماتم منایا گیا۔ تقریباً دنیا کے تمام ممالک سے وفود آپ کی تجہیز و تکفین میں حصہ لینے کے لیے آئے۔ پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر داخلہ اور دیگر متعدد وزراء نے خصوصی شرکت کی۔ جھیل ڈل کے کنارے نسیم باغ کے ایک گوشے میں شیخ صاحب کی ابدی آرام گاہ بنی۔ آپ کی وفات سے ملک ایک عظیم قوم پرست مجاہد آزادی، جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے علمبردار سے محروم ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر فاروق عبداللہ ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے۔

☆☆☆

سر سید احمد خان

سر سید احمد خان 1817ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر تقی قناعت پسند، پرہیزگار، نیک سیرت اور متقی بزرگ تھے۔ ان کی والدہ بھی نہایت نیک سیرت، روشن دماغ اور پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ اس لئے انہوں نے سر سید کی تعلیم و تربیت کا انتظام اچھی طرح کیا۔ سر سید کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور اسی وقت شاہی دربار میں رسائی ہو گئی۔ جس کا سلسلہ عالمگیر تک قائم رہا۔ سر سید کی ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ قرآن مجید کے بعد فارسی و عربی پڑھی۔ پھر صرف و نحو، منطق، فلسفہ، اقلیدس اور ہیئت وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ علم فقہ، حدیث اور قرآن پاک کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد سے ہی شاہی قلعہ سے ملنے والی تنخواہ بند ہو گئی۔ اس لیے سر سید کو نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ سر سید کے خالو مولوی خلیل اللہ اس وقت دہلی میں صدر امین تھے۔ انہوں نے 1838ء میں سر سید کو اپنی کچہری میں محرر مقرر کر دیا تھا۔ پھر فروری 1939ء میں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔ وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔

دسمبر 1841ء میں منصف مقرر ہو گئے۔ 1846ء میں پوری سے فتح پور تبدیل ہو گئے۔ چار برس وہاں رہے۔ اسی سال بہادر شاہ کی طرف سے سر سید کو ان کا موروثی خطاب ملا۔ 1846ء میں دہلی میں تبدیل ہو گئے۔ 1855ء میں بجنور منتقل ہو گئے۔ ابھی وہاں ہی تھے کہ 1858ء کا غدر ہو گیا جو کہ مسلمانوں کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔ یہ تمام حال سر سید نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ غدر میں سر سید نے مختلف طریقوں سے انگریزوں کی مدد کی اور قوم کو تباہی سے بچا لیا۔ جس سے انگریزوں کی نظروں میں سر سید کی شہرت بڑھ گئی۔ 1867ء میں وہ بنارس کے جج مقرر ہوئے۔ 1869ء میں لندن گئے۔ 1870ء میں واپس آئے۔ سر سید نے 1961ء میں مراد آباد اور غازی پور میں انگریزی اسکول کھولے۔ 1862ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ لندن سے واپسی کے بعد علی گڑھ میں 1876ء میں ایک اسکول کھولا جو ترقی کرتے کرتے ہائی اسکول، کالج اور پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن گیا۔ 1878ء میں سر سید نے پنشن لے لی اور اس کے بعد ساری عمر قوم، ملک اور زبان و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ لیکن زیادہ وقت کالج کی خدمت میں صرف ہوا۔ سر سید نے 27 مارچ 1898ء کو رات دس بجے علی گڑھ میں وفات پائی اور کالج کی مسجد

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ

شیخ محمد عبداللہ نام اور شیر کشمیر عوام کا دیا ہوا خطاب۔ آپ 5 دسمبر 1905ء کو موضع صورہ سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرینگر میں ہی حاصل کی۔ بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی اور بطور اسکول ٹیچر سے کام کرنا شروع کیا۔ مگر اصلی میدان سیاست تھا۔ اس لیے جلد ٹیچری چھوڑ کر سیاست میں حصہ لینے لگے۔

آپ نے 1931ء میں مسلم کانفرنس میں شامل ہو کر کسانوں، مزدوروں کے عوام کی حالت سدھارنے کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے 1939ء میں مسلم کانفرنس کی جگہ نیشنل کانفرنس قائم کی۔ جس میں بلا امتیاز مذہب وملت ہر ایک شامل ہو سکتا ہے۔ اس جماعت میں ہندوؤں اور سکھوں کو بھی شامل کر کے آپ نے چالیس لاکھ ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کا مصمم ارادہ کیا۔

آپ نے 1945ء میں "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ ڈوگرہ شخصی راج کے خلاف بلند کیا۔ جس پر آپ کو تین سال قید سخت کی سزا ملی۔ مگر پاکستان حملے کے پیش نظر آپ کو اکتوبر 1947ء میں رہا کر دیا گیا۔ جب قبائلی ریاست پر حملہ آور ہو کر سرینگر کے قریب پہنچے تو آپ نے حسن تدبیر سے کام کر کے ہندوستان کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہندوستان سے مدد حاصل کر کے ریاستی عوام اور ریاست کو بچا لیا۔ آپ کو 7 مارچ 1948ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا۔ آپ کے مشورے پر ریاست کے مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر کے فوج طلب کی۔ اس فوج کے پہنچنے پر ریاست سے قبائلیوں کو بھگا دیا گیا۔ آپ 1953ء تک ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ 18 اگست 1953ء کو آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔ اور بخشی غلام محمد کو ریاست کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ آپ نے 1945ء سے اکتوبر 1947ء تک اگست 1953ء سے جنوری 1968ء تک ایک طویل عرصہ اسیری اور نظر بندی میں کاٹا۔

ہندوستان کی پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی صاحبہ نے 1975ء میں شیخ صاحب کو ریاست میں نان پارٹی گورنمنٹ بنانے کی دعوت دی۔ چنانچہ 25 فروری 1975ء کو جموں و کشمیر میں نان پارٹی گورنمنٹ قائم ہوئی اور شیخ صاحب وزیر اعلیٰ بنے۔ بعد میں 1977ء میں نان پارٹی حکومت ٹوٹ گئی اور ریاست میں عام انتخابات عمل میں آئے

کی لنگوٹی اوڑھنے والے فقیر کی خدمت میں بڑے بڑے راجوں اور نوابوں کے سر جھک جاتے تھے۔ مہلک بموں کا مقابلہ کرنے والا لاثانی سپاہی ہر روز بے دھڑک جاتا تھا۔ یہی نوع انسان کے مصائب کی گتھیاں سلجھانے والا تیر سے دو دھ میں سفر کرتا تھا۔ آنے والی نسلوں کے لیے یہ سب کچھ حیرت کن ہوگا۔ اس مہاپرش کی موت کا باب نہایت المناک ہے۔ وہ 30 جنوری 1948ء کو ایک کج فہم اور تنگ نظر نوجوان کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

☆☆☆

مہاتما گاندھی

آپ کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ 1869ء گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک قصبہ پوربندر کو آپ کی ولادت سے شرف حاصل ہوا۔ پوربندر کا پورا نام سداما پوری تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگلستان میں بیرسٹری کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ اپنے بھائی کے چند مسلمان دوستوں کے حق میں وکالت کرنے کی غرض سے جنوبی افریقہ پہنچے، وہاں کے ہندوستانیوں کی حالت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ یونین گورنمنٹ کی سختی کے خلاف جہاد کا علم بلند کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے ہم وطنوں کے حقوق منوا کر دم لیا۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ہندوستان میں جب رولٹ ایکٹ نافذ ہوا تو اس کی پوری پوری مخالفت کی۔ تحریک عدم تعاون کی داغ بیل ڈال کر اہل وطن میں مکمل آزادی کی خواہش بھر دی۔ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پُرامن ستیہ گرہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اتحادیوں نے سلطنت ترکی کے ٹکڑے کر کے وہاں کی خلافت ختم کرنے کی کوشش کی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے مولانا آزاد، محمد علی اور شوکت علی کی قیادت میں خلافت ترکی کی از سر نو زندہ کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی۔ مہاتما نے اس تحریک میں اپنے مسلمان بھائیوں کا پورا ساتھ دیا۔ ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ہندو بھائیو! اگر تم گائے بچانا چاہتے ہو تو خلافت کو بچانے کے لیے جان تک قربان کر دو۔ مسلمان ساتھیوں کی آنکھوں میں مست روحانی اور دلی تسکین کے آنسو بھر آئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ گاندھی جی واقعی مہاتما ہیں۔

اصول پرستی کے اعتبار سے موجودہ دنیا کا کوئی بھی بلند پایہ انسان مہاتما گاندھی کے حیرت انگیز درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ عدم تعاون کی تحریک کے لیے آپ نے عدم تشدد کو ایک نہایت ضروری جزو قرار دے رکھا تھا۔ چورا چوری واقع بہار کے کچھ لوگوں نے اشتعال میں آ کر وہاں کے تھانیدار سپاہیوں کو قتل کر دیا تو اصول کے احترام نے مہاتما گاندھی کو یہ حکم جاری کرنے پر مجبور کر دیا کہ عدم تعاون کی تحریک بند کر دی جائے۔ 1929ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہندوستانی تاریخ کی معرکتہ آلا قرارداد پاس ہوئی کہ اب ہندوستانی درجۂ نوآبادیات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ہم مکمل آزادی سے کم کسی بھی قسم

کی حکومت قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے مہاتما گاندھی کو تحریک سول نافرمانی کا سالار اعظم مقرر کیا گیا۔ 1935ء میں ہمارے سالار اعظم نے قانون نمک کی خلاف ورزی شروع کی۔ شراب اور بدیشی کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ لگایا گیا۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ سرکار کو ٹیکس، لگان اور آبیانہ وغیرہ ادا نہ کیا جائے۔ لارڈ ارون کے حکم سے مہاتما گاندھی اور تحریک سول نافرمانی میں حصہ لینے والے افراد کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ عوام کے جذبات اور جوش کا یہ عالم تھا کہ جیلوں میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ آخر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ کی وساطت سے 1931ء میں گاندھی ارون معاہدہ طے ہوا جس کی رو سے سیاسی کشمکش کے باب میں ہندوستان کے حقوق تسلیم کر لیے گئے۔ گاندھی جی نے تمام تر کوششیں اچھوت اودھار کی طرف مبذول رہی ہیں۔ تعلیم اخوت اور تبلیغ مساوات کی ایسی روشن مثال عہد حاضر کو چھوڑ کر ماضی کے صفحات میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی آپ نے اپنے آپ کو بھی ہریجن کہنا شروع کر دیا اور ہمیشہ بھنگیوں کی آبادی میں قیام فرمانے لگے۔ ہریجنوں کی تعلیم اور ان کی ترقی کے لیے آپ نے ایسے ایسے قدم اُٹھائے ہیں کہ کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ حق پسندوں نے آپ کی کوششوں سے متاثر ہو کر ہریجنوں کے لیے مندروں کے دروازے کھول دیے۔ کنوؤں کے پانی کی اجازت دی گئی۔

مدرسوں میں اپنے بچوں کے ساتھ پڑھنے اور ہسپتالوں میں اپنے بیماروں کے ساتھ علاج کرانے کا انتظام کر دیا۔ اپنے خیالات کے اظہار کی خاطر "نیوانڈیا" اور "نوجیون" کو بند کر کے گاندھی جی نے "ہریجن" کے نام سے ایک بے بدل پرچہ شروع کیا، جسے دنیا بھر کے ارباب فکر احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

سودیشی کا پرچار مہاتما گاندھی کے پاکیزہ مقاصد میں سے ایک تھا۔ آپ کھادی کو ہندوستان کی نجات کا ذریعہ اور چرخے کو امن اور دوستی کا سب سے موثر ہتھیار کہتے تھے۔ آپ کے نزدیک چرخہ ہندوستان کی دیہاتی صنعتوں کا مرکز ہے جس سے ہم برطانیہ، روس اور امریکہ کو شکست دے سکتے ہیں۔ گاندھی جی ایشور کی ذات پر اس قدر بھروسہ رکھتے تھے، کہ رام نام اور صرف رام نام کو سب بیماریوں کا علاج بتاتے تھے۔ رام اور رحیم اور دوسرے دیگر وہ آپ کے لیے ایک ہی ذات پاک کے مختلف نام ہیں، صبح و شام پرارتھنا کرنا آپ کی رائے میں ہر انسان کے لیے سانس لینے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہندو مسلم اتحاد آپ کو جان سے بھی بڑھ کر عزیز تھا۔ قدرتی طریقہ علاج کو پسند کرتے تھے، گئو رکھشا کے پکے حامی تھے، اس مہایوگی اور مہاتیاگی کو اپنی ذات پر مکمل ضبط حاصل تھا۔ مہاتما گاندھی کی ذات کا یہ اثر تھا، کہ چاروں

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کا اصلی نام فیروز بخت تھا۔ لقب محی الدین اور کنیت ابوالکلام اور آزاد تخلص تھا۔ 1888ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکہ میں ہی حاصل کی۔ عربی فارسی کے عالم ہوئے۔ علوم اور ادبیات پر بھی عبور تھا۔ اپنے والد کے ساتھ مکہ سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں قیام کیا۔ بچپن سے ہی انشاء پردازی کا شوق تھا۔ اخبارات میں حصہ لینے لگے۔ جس سے طرز نگارش کی دھوم مچ گئی کلکتہ سے ہفت روزہ رسالہ الہلال نکالا۔ جس کے خیالات مقبول ہونے پر حکومت نے اسے بند کر دیا۔ بعد میں قلم کی طرح زبان پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ بار بار قید کیے گئے۔ مگر سیاست میں ان کا انہماک بڑھتا گیا۔ انھوں نے زبان و ادب کی خدمت چھوڑ کر سارے وقت حصول آزادی پر صاف کرنا شروع کر دیا اور کانگریس کے سرگرم کارکن بن گئے اور بعد میں صدر منتخب ہوئے۔ ملک کی آزادی کے بعد جمہوریت حکومت قائم ہوئی تو آزاد وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اپنے عہد میں انھوں نے محکمہ کو بہت بڑی ترقی دی اور اپنے فرائض نہایت جانفشانی سے انجام دئے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی، نہرو اور دوسرے مجاہدین آزادی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ قلبی بیماری میں مبتلا ہو کر 22 فروری 1958ء کو وفات پائی اور جامع مسجد کے پاس سپرد خاک ہوگئے۔

آزاد بچپن ہی سے بڑے ذہین اور سنجیدہ تھے۔ ابتداء ہی سے زبان و ادب کے گیسو سنوارنے لگے۔ جس کے خیال الہلال اور البلاغ کو ذریعہ بنایا۔ ان کی تحریک میں ہزاروں رعنائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے طرز نگارش میں ایک مجتہدانہ شان پائی جاتی ہے۔ بلا کی رنگینی شگفتگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ آزاد دور جدید کے مثالی ذہنوں میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھیں میدان علوم عربی، فارسی اور ادب میں زبردست بصیرت حاصل تھی۔

ابتدائی دور میں ان کی ایک خود نوشت سوانح عمری تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کے ادبی کارناموں میں ”غبار خاطر“ کو ایک اہم امتیاز حاصل ہے۔ یہ آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران قلعہ احمد نگر کی نظر بندی میں اپنے ایک دوست حبیب الرحمان خان شیروانی کو لکھے تھے۔ جو اس وقت تو ان تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن بعد میں مکتوب الیہ تک پہنچے جنھیں بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ ”غبار خاطر“ لطافت، انشاء اور بلیغ خیال آرائی کے اعتبار سے اردو میں اپنے طرز کی بہت بلند پایہ چیز ہے۔

آزاد نے آسان طرز تحریر کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دل کشی اور جوش کی کمی ہے۔ ان کی تحریروں سے خطیبانہ بلند آہنگی، بیان کی قدرت، شوکت اور عظمت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

☆☆☆

کریں۔ مسجد، گوردوارہ، دھرمشالہ اور گرجا ایک ہی ہیں۔ ہم سب کو پیدا کرنے والا صرف خدا ہے۔ خدا کرے ہمارے پیارے ہندوستان کو اس موذی نفاق کے ہاتھ سے جلد نجات ملے تاکہ ہم سب ایک مذہب و ملت کے آدمی آپس میں یوں رہیں کہ گویا ہم ایک ہی ماں باپ کے بیٹے ہیں۔

اے بھائیو! آؤ ہم تم شیر و شکر ہو جائیں۔ امن سے رہیں۔ غیر ممالک کے باشندوں کو اپنی جہالت اور کوتاہ اندیشی پر ہنسنے کا موقع نہ دیں۔ غرض اتفاق کی تعریف جس قدر کی جائے مناسب ہے کیوں؟ جن چیزوں یا کاموں کو انسان نے ناممکن سمجھا تھا۔ اتفاق نے ڈنکے کی چوٹ سے کہہ دیا کہ ہم وہ کام با آسانی سے کر سکتے ہیں۔

پیارے ناظرین! تم اگر بلا امتیاز مذہب یا قوم یا فرقے کے ایک دوسرے کی امداد میں متفق ہو جاؤ لیکن یاد رکھو کہ ہمیشہ نیک کام پر اتفاق کرو۔ اس کے طفیل تمہیں دولت و اقبال اور آزادی نصیب ہوگی اور بڑے حرمت سے زندگی بسر ہو گی۔

☆☆☆

پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو 14 نومبر 1889ء کو الہ آباد کے ایک خوشحال کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام موتی لال نہرو تھا۔ جو الہ آباد میں ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ ابتدا میں پنڈت جواہر لال نہرو کی تعلیم کافی عرصہ گھر پر ہوئی۔ انگریزی پڑھانے والے استاد گھر ہی پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ بعد میں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ 16 سال کی عمر میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس آئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ لیکن انہیں یہ زندگی پسند نہ آئی۔ ان کے دل میں وطن کی سچی محبت اور آزادی کی تڑپ تھی۔ ان کی شادی کشمیری خاندان میں کملا نہرو سے کی گئی۔ لیکن ان کو گھریلو مسرت کے بجائے ملک کی آزادی کا کام زیادہ عزیز تھا۔ ان کی بیوی اکثر بیمار رہتی تھی مگر پنڈت نہرو کا زیادہ وقت جیل میں اور سیاسی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک طویل عرصہ بیمار رہ کر کملا نہرو کا انتقال ہو گیا۔ مگر پنڈت نہرو آزادی کی تحریک میں سرگرم رہے۔ لاہور کے کانگریس کے اجلاس میں 1929ء میں نہرو کو کانگریس کا صدر چن لیا گیا۔ اسی اجلاس میں ان ہی کی صدارت میں مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا۔ اس کے بعد کئی بار انہیں کانگریس کا صدر چنا گیا۔ بھارت کو آزاد کرانے کی خاطر پنڈت نہرو نے کئی بار جیل کاٹی۔ پھر بھی انھوں نے آزادی کی لڑائی برابر لڑی۔ اور آخر کار 15 اگست 1947ء کو بھارت آزاد کرا لیا۔ اس دن نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے اور اسی عہدے پر 17 مئی 1964ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ جس سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہری باب بند ہو گیا۔ پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے کروڑوں عوام کے دلوں پر بھی حکومت کی۔ ہندوستانی عوام کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ پنڈت نہرو ایک سیاسی رہنما اور وزیر اعظم ہونے کے علاوہ ایک عظیم انسان بھی تھے ان کی عظمت کا احترام تمام دنیا کرتی ہے۔ وہ ایک عظیم مفکر اور مصنف تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس طرح ملک اور قوم کے علاوہ انہوں نے زبان اور ادب کی بھی خدمت کی ہے۔ انہیں مذہبی، نسلی اور رنگ کے تعصبات سے نفرت تھی۔ وہ سب انسانوں سے محبت کرتے تھے۔ بچوں سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں سے انہیں ہمدردی تھی۔ ساری زندگی وہ قوم، ملک، زبان و ادب کی خوشحالی اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

ضرورت ایجاد کی ماں

انسان ایک حالت پر کبھی قانع نہیں رہتا۔ ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی موجودہ حالت سے ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اس ترقی کے راستے پر قدم قدم پر اسے مشکلات کا جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں، اس سے دور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی ضرورت دنیا میں مختلف ایجادوں کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں جب انسان کو خوراک کی ضرورت پیش آئی تو اس ضرورت نے اسے کھیتی باڑی کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے مختلف قسم کے آلات کاشتکاری کے لیے ایجاد ہوئے۔ موسمی مشکلات میں سردی، گرمی، برف باری وغیرہ جب اس کے لیے مشکل ہوا تو گھر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جسم ڈھانپنے کی ضرورت نے اسے پہلے جنگل چھال اور کھال اوڑھنے پر مجبور کیا۔ جس سے ترقی کرتے کرتے وہ نہایت عمدہ اور نفیس کپڑے تیار کرنے لگا۔ سفر کی مشکلات اور مال اور بار برداری کی تکلیفوں نے اس کے لیے سواری کی ضرورت پیدا کی، جو چھکڑوں پہیوں سے ترقی کرتے کرتے ریل گاڑی اور موٹر کار، جہازوں اور ہوائی جہازوں کا موجب ہوئی۔ خبر رسانی کی ضرورت نے ٹیلیگراف اور ٹیلیفون جیسی ایجادیں پیدا کیں۔ بیماریوں سے بچنے کے لیے علم طب پیدا ہوا، جس میں نئے نئے آلات ایجاد کیے گئے۔

غرض دنیا میں ہم جس چیز پر نظر ڈالیں، معلوم ہوگا کہ اس کی ایجاد کی کوئی نہ کوئی ضرورت ہے۔ اور بغیر ضرورت کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ ادنےٰ ادنےٰ چیزوں سے لے کر بڑی بڑی سائنٹیفک ایجادوں کا باعث ضرورت اور صرف ضرورت ہے۔ اور جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں۔ انہیں ضروریات کو رفع کرنے کے لیے نئے نئے چیزیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے جو ایجادیں موجدوں نے دنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیں۔ وہ آج دنیا کی تباہی کا باعث ثابت ہو رہی ہے۔ وہی ہوائی جہاز جو سفر کی سہولت کے لیے ایجاد ہوئے تھے آج ان کے لیے آبادیوں پر بم گرا کر انہیں ویران کیا جاتا ہے۔

اب موجودہ زمانے کے موجدوں کی پوری توجہ جنگی ضروریات کی ایجادوں پر لگی ہوئی ہے۔ اور ایسی ایسی گیسیں اور آلے ایجاد کر رہے ہیں جو دنیا کو کم از کم وقت میں تباہ کر سکیں۔ لیکن ان تباہ کن آلات سے بچاؤ کے لیے بھی سائنس کی دنیا میں نئی نئی چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں، جن کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔

اتفاق میں طاقت

لفظ اتفاق سے ہر کوئی واقف ہے اور بلحاظ معانی کے سب اس کو کارآمد سمجھتے ہیں۔ نظام عالم کو بہ غور دیکھتے ہیں تو اس کی بڑی ضرورت پاتے ہیں۔ آدمی کا مدنی الطبع ہونا خود اس امر کی دلیل ہے۔ وہ گاؤں، شہروں، قصبوں میں اتفاق سے رہتا ہے اور ہمیشہ ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ کوے، شہد کی مکھیاں، اور حشرات الارض اتفاق سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہم انسان ہو کر ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہیں۔ چونکہ انسان مختلف الطبائع کا حامل ہے۔ تو اس کا آپس میں مل بیٹھنا اور ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا، رنج و راحت میں شریک ہونا ضروری ہے۔ آسمان کی طرف دیکھو جس میں ستارے، سیارے، با اتفاق ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جگمگاتے ہیں تو کس حسن سے روشنی پہنچتی ہے۔ رات کو ہمیں سفر میں رہنمائی کرتے ہیں۔ وقت کا اندازہ بتاتے ہیں۔ اتفاق کا سبق دیتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں باہمی اتفاق سے شہد پیدا کرتی ہیں۔ اگر آدمیوں میں اتفاق ہو تو نہ جانے کیسے کیسے عمدہ نتیجے پیدا کریں۔ اگر وہ آپس میں متحد ہو جائیں تو پہاڑ کو گرا سکتے ہیں۔ دریا کی روانی کو روک سکتے ہیں۔ اتفاق سے قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اتفاق کی بدولت انسان ہر کام میں ترقی کر سکتا ہے۔ اپنے ملک کو مخالفوں سے بچا سکتا ہے مگر ہر ایک کے خیالات یکساں نہیں ہیں۔ جہالت کے باعث ایک دوسرے کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں۔ ہم روزانہ معاملے میں سرکاری عدالتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ہر معاملے میں ایک دوسرے کے مخالف کوششیں کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ اتفاق ایک ایسی بلا ہے جس سے خوشی، ترقی اور آبادی سے ویرانی ہو جاتی ہے۔ یہ گھروں، ملکوں، خاندانوں کو مثل وبائی امراض کے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم پھر بھی باز نہیں آتے۔ اگرچہ پھوٹ یا نااتفاقی ہمارے ملک کا مشہور میوہ ہے مگر جب اس کے درخت کی جڑیں اکھاڑ کر کھارے سمندر میں ڈال دی جائیں گی پھر خود ہی تقریباً مفقود ہو جائے گا۔ مگر یہ درخت اتفاق اور علم کی کلہاڑی سے کاٹا جا سکے گا۔ اس لیے تمام بھائیوں کو چاہیے کہ اس مصیبت کے وقت میں ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ آپس میں بھائی بھائی بن جائیں۔ دوسروں کی عزت کو اپنی عزت کا خیال کریں۔ ہر ایک مذہب کو اچھا سمجھیں، چھوٹوں کو پیار، بڑوں کا ادب

محنت کامیابی کی کنجی

جو محنت کرے ہے وہی سرفراز
ہے انسان کی عظمت کا محنت میں راز

محنت کا مفہوم اور اس کے فائدے۔ محنت کے معنی تکلیف یا دکھ اٹھانا اور مشکلات کرنا ہوتا ہے۔ قدرت نے انسان، حیوان، چرند پرند یا دیگر جاندار کے لیے محنت کو لازم قرار دیا ہے۔ ہر چیز یا ہستی کی بقا محنت پر موقوف ہے۔ دنیا کی ترقی کا راز محنت میں مضمر ہے۔
بقول فردوسی

کہ اندر جہاں سود بے رنج نیست
کسے را کہ کاہل بود گنج نیست

علم و ہنر، جاہ و جلال، شان و شوکت، فضل و کمال سب کچھ محنت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ کتنی لوگ ہیں دنیا میں ہر طرح کی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ زمیندار کو دیکھیے کہ وہ محنت سے اپنی زمین میں ہل چلاتا ہے۔ کھاد ڈالتا ہے۔ بیج بوتا ہے وقت پر پانی دیتا ہے۔ آخر اسے اپنی محنت کا پھل مل جاتا ہے۔ لاکھوں من غلہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کی زندگی خوشی میں بسر ہوتی ہے۔ جو محنت سے جی چراتے ہیں وہ ذلیل و رسوا اور ترقی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کیوں کہ

جہاں میں جنھیں کام سے کام ہے
انھیں کام میں لطف و آرام ہے

محنت اندازے کے مطابق ہونی چاہیے۔ اپنی طاقت سے بڑھ کر محنت غلطی ہے۔ اگر محنت حد سے گذر جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اپنی طاقت کے مطابق محنت کی جائے تو انسان تندرست اور خوش و خرم رہے گا۔ بعض طلبا اتنی محنت کرتے ہیں کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اگر طلبا آہستہ آہستہ محنت کریں تو وہ مقصد میں بخوبی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب

کہا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ ایسی محنت کا کام نہ کرو جس سے صحت میں فرق آئے۔ سب سے ضروری چیز صحت ہے۔ صحت کے بغیر محنت ممکن نہیں۔ پس محنت ضرور کرنی چاہیے مگر اعتدال کو مد نظر رکھو۔ محنت تندرستی، امارت اور عزت کا ذریعہ ہے۔ محنت سے انسانی اخلاق پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ انسان گناہ و بے کاری سے دور رہتا ہے۔

دنیا میں جتنے فلاسفر، علما و اولیا اللہ یا قد آور لوگ ہوئے ہیں، وہ تمام محنت کے عادی تھے اور انہوں نے اسی کے طفیل بلند درجہ حاصل کیے۔ دنیا میں تمام ترقی محنت سے وابستہ ہے۔ محنت کرنے والا ذہین اور لائق ہوتا ہے۔ ہماری قسمت کا تعلق بھی محنت پر موقوف ہے۔ قسمت کا بنانے والا خود انسان ہے۔ قسمت ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم محنتی ہوں گے تو قسمت بھی اچھی ہوگی۔
الغرض

عمل کے مطابق صلہ ہے مدام
کہ املی سے ہو املی، آموں سے آم

کوئلوں کو سیاہی اس وقت چھوڑتی ہے جب وہ آگ میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان جب محنت کرتا ہے تو کاہلی دور ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ راحت نصیب ہوتی ہے۔ دولت قدم چومتی ہے۔ ثابت ہوا کہ جو شخص مزدوری کرے گا وہی چوری کھائے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم محنت کے عادی بنیں اور سستی کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ

تساہل ہٹاؤ کہ بیکار ہو
کہ زنگار کھا جائے تلوار کو

☆☆☆

ماحولیاتی آلودگی

ماحولیاتی آلودگی کا مطلب گرد و پیش کے ماحول کا گندہ یا نجس ہونا ہے۔ انسان کے گرد و پیش خواہ پانی ہو یا کہ ہوا (فضا) یا زندگی کے دوسرے سامان ان کی پراگندگی یا ان کی نجاست خود زندگی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ کیوں کہ دنیا میں تمام زندہ چیزوں کے لیے براہ راست طور پر صاف پانی، غذا اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان چیزوں کو پراگندہ کر دیا جائے تو ان زندہ مخلوقات کی زندگی اس کرۂ ارض پر کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ یہ خود ایک شفاف ماحول کی زائیدہ ہیں۔

ماحول اور آب و ہوا قدرت کا وہ انمول تحفہ ہیں، جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ زندگی کے لیے لازمی ہے کہ اسے صاف و شفاف پانی، ہوا، غذا اور حرارت ملتی رہے۔ ورنہ زندگی پر موت کی اور موجود پر فنا کی فتح کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ قدرتی ماحولیات کے تناسب و توازن کو قائم رکھنے میں گیسوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ نباتات اور سورج کی حرارت میں ایک خاص تناسب اور توازن قائم ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ تناسب و توازن ذرا بھی بگڑا تو زندگی کے لیے سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

انسان بہت سے کام ایسے کرتا ہے جس کی وجہ سے قدرتی ماحول میں غیر ضروری خلل پیدا ہوتا ہے اور اس صورت میں ماحولیاتی توازن بگڑ کر خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بڑے اور صنعتی شہروں میں آج سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہاں دھوئیں اور گاڑیوں سے خارج شدہ زہریلی گیسوں کی کثافت ہے۔ جہاں ایک طرف دھوئیں کی کثافت کے سبب سانس میں عدم توازن اور آنکھوں میں جلن کا احساس مستقل جڑ پکڑ لیتا ہے وہیں دوسری زہریلی گیسوں کی وجہ سے نہایت خطرناک اور ہلاکت خیز بیماریاں عام ہونے لگتی ہیں۔ صنعتی شہروں میں کارخانوں کے دھوئیں اور ان کے فضلات سے ذیلی آبادی کے اطراف و جوانب مسموم و خطرناک ہو چکے ہیں۔ جنگلات کی کٹائی جس پیمانے پر جاری ہے اس سے ماحولیات کے لیے مزید خطرہ پیدا ہو گیا۔ جنگلات جو بارش کے لیے ضروری ہیں یا مٹی کے کٹاؤ کو روکنے کے لیے معاون ہیں یا جن سے سیلاب اور دوسری قدرتی آفات سے حفاظت ہوتی ہے۔ خود ہمارے ملک کے نقشے سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا براہ راست نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں بارش کا توازن بگڑ چکا ہے۔ اور مٹی کا بڑا

حصہ سمندروں میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سیلاب سے ملک کو ہر سال بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اور ان سب سے حفاظت کے لیے جنگلات کا ہونا اشد ضروری ہے۔ پانی میں فضلات اور دوسرے ضائع شدہ کیمیکلس کے اخراج سے پانی کی آلودگی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ قلبی امراض اب ان صنعتی شہروں کے باسیوں کا مقدر بنتے جا رہے ہیں۔

دوسری جانب بین الاقوامی سطح پر ممالک کے مابین جنگ و جدال کی صورت میں بے تحاشہ بارود اور دوسرے کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال سے نہ صرف انسانی زندگی کو براہ راست خطرہ پیدا ہو سکتا ہے بلکہ اس کے دوررس نتائج کے طور پر آب و ہوا اور فضا کی دوسری موافق صورتحال پر بھی منفی اور خطرناک اثر پڑتا ہے۔ اور نتیجتاً زندگی کے لیے طویل المدتی خطرات و خدشات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی سے دنیا کو محفوظ رکھنے کے لیے عالمی پیمانے پر ہر سطح پر اقوام عالم کو اہم رول ادا کرنا ہے لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ عقل کو بروئے کار لائیں اور دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ رکھیں، ورنہ خود انسان کا وجود بھی اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا جس طرح قوی الجثہ دیو ہیکل ڈائناسار کا وجود اس دنیا سے مٹ گیا۔

☆☆☆

۶۔ خدمت کا احساس پیدا کرنا: لوگوں میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے قومی یک جہتی نہایت اہم ہے۔ اس سے ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۷۔ جمہوریت کا بقا: جمہوریت کا بقا اور احیا کے لیے قومی یک جہتی ضروری ہے۔ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی غیر موجودگی میں جمہوریت کا احیا و بقا ناممکن ہے۔

۸۔ قومی بقا: قوم کے احیا و بقا کے لیے قومی یک جہتی ضروری ہے۔ اس کے بغیر قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور آپسی لڑائی جھگڑے بدنظمی کی طرف لے جاتے ہیں۔

۹۔ سماجی ارتقا: سماجی ارتقا اور استحکام کے لیے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی نہایت اہم ہے۔ برے رسم و رواج، غلط تقلید اور رہن سہن کے بے کار طریقے قومی اور ملی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کی تمام برائیاں دور کرنے میں قومی یک جہتی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ بیرونی دشمنوں کا مقابلہ: بیرونی حملوں کا مقابلہ تب ہی کیا جا سکتا ہے جب کہ ملک میں اتحاد اور قوم میں یک جہتی ہو۔ ورنہ ہر بیرونی طاقت قومی نا اتفاقی کا فائدہ اٹھا کر حملہ آور ہوتی ہے۔

۱۱۔ امن و سکون برقرار رکھنا: ملک میں امن و سکون برقرار رکھنے کے لیے قومی یک جہتی نہایت ضروری ہے۔ اس سے لوگوں میں دیانت داری، ہمدردی، احساس ذمہ داری، احساس خدمت گزاری، احساس نظم و ضبط اور قومی وقار کے لیے جذبہ ایثار پیدا ہوتا ہے۔ جو امن و سکون کے لیے لازمی ہے۔

اقتصادی ترقی قومی یک جہتی ہی کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔ اس سے صنعت و حرفت، تجارت، زراعت اور ملازمتوں میں بڑھاوا ہوتا ہے۔ قومی یک جہتی سے خود اعتمادی اور خوش حالی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اس سے سماجی اقتصادی ترقی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذات پات، فرقہ واریت، علاقائی تعصب، لسانی تنگ نظری، اقتصادی نابرابری، سماجی نابرابری، مختلف سیاسی جماعتیں اور اچھے راہنماؤں کی غیر موجودگی قومی یک جہتی میں رکاوٹیں ہیں۔ لیکن پھر بھی قومی یک جہتی کو بڑھاوا دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہوریت کی کامیابی، ایک طاقت ور قوم کی تعمیر، اتحاد اور امن و سکون کا برقرار رہنا، کثرت میں وحدت، قوم کی احیا و بقا، سماجی، اقتصادی، تمدنی ترقی، احساس ذمہ داری پیدا کرنے، بیرونی طاقتوں کے حملوں سے

بچاؤ، تعصب اور تنگ نظری کو دور کرنے، ذات پات اور علاقائی بندھنوں کو دور کرنے کا دارومدار قومی یک جہتی پر منحصر ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی قومی یک جہتی ہی کی وجہ سے ممکن ہے۔ قومی یک جہتی ہی پر ملک اور قوم کی بقا کا انحصار ہے۔ اس لیے قومی یک جہتی کو بڑھاوا اور برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔

☆☆☆

کثرت سے سگریٹ نوشی کرنے والے لوگ جن میں ڈاکٹر بھی شامل ہیں ان کو یہ باتیں کافی تلخ محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یا تو انہیں نظر انداز کر دیں یا ان کو غلط اور بے بنیاد ثابت کرکے ہنسی میں اڑا دیں۔ اس سلسلے میں ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر سگریٹ اور پھیپھڑوں کے کینسر میں کوئی تعلق ہے تو کوئی سائنسداں سگریٹ میں سے کینسر پیدا کرنے والا مادہ نکال کر مادہ کیوں نہیں پیش کر سکتا؟ لیکن اب حال میں امریکہ میں ایسا کیا جا چکا ہے یہ پتہ لگایا گیا ہے کہ سگریٹ کے جلنے سے ایک قسم کا مادہ بنتا ہے جس کو بار بار چوہوں کی جلد پر لگانے سے جلدی کینسر پیدا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

قومی یکجہتی

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ لیکن ساری دنیا ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ آج کے دور میں ملک میں قومی یک جہتی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ قومی یکجہتی سے مراد ہندوستان کی وحدت اور اتحاد ہے۔ قومی یک جہتی ایک ایسا آلہ ہے جس سے ساری قوم ایک ہی لڑی میں پروئی جا سکتی ہے۔ قومی یک جہتی کثرت میں وحدت کا نام ہے۔ سماجی اقتصادی، سیاسی، تمدنی، لسانی، مقامی اور مذہبی اختلاف کو ختم کر کے قوم کو ایک سطح پر لانا قومی یکجہتی کہلاتا ہے۔ قومی یکجہتی کے لیے جذباتی ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے۔ ہندوستان میں مختلف عقیدوں اور ذاتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ ملکی ترقی اور قومی اتحاد کے لیے جذباتی ہم آہنگی لازمی ہے۔ ہندوستان کے بقا کا راز قومی یک جہتی ہی میں پوشیدہ ہے۔

قومی یک جہتی حسب ذیل وجوہ کی بنا پر بے حد ضروری ہے:

۱۔ اتحاد قائم کرنا: سیاسی، سماجی اور مذہبی اتحاد قائم کرنے کے لیے قومی یک جہتی کی ضرورت ہے۔ اتحاد سے قوم کی طاقت اور استحکام کو تقویت ملتی ہے۔

۲۔ ایک طاقتور قوم کی تعمیر: ایک طاقتور قوم کی تعمیر کے لیے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ اس سے خیالات، عمل، تمدن اور انسانی خدمات کے سلسلے میں قوم کی تعمیر ہوتی ہے۔

۳۔ علاقائی اور ذات پات کی دیواریں توڑنا: تنگ نظری، ذات پات اور علاقائی دیواروں کو توڑنے کے لیے قومی یک جہتی بہت ضروری ہے۔ ورنہ عوام و قوم ان ہی پھندوں میں پھنس کر رہ جائے گی۔

۴۔ کثرت میں وحدت کا ہونا: ہندوستان مختلف ذاتوں، مذہبوں، تمدنوں، زبانوں، رنگوں، نسلوں اور قوموں کا ملک ہے۔ اس میں رنگارنگی اور کثرت میں وحدت پایا جانا ضروری ہے۔ یہ کام صرف قومی یک جہتی ہی کی وجہ سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ہندوستانی تمدن کی ترقی: ہندوستانی تمدن کی ترقی، قومی زبان اور قومی ادب کی ترقی کے لیے یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ ماضی کے تمدن کے تحفظ اور بقا کے لیے قومی یک جہتی کا ہونا لازمی ہے۔

میں کوہ پیما ہوں گا اور مجھے امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ میں اس جنگ میں فتح حاصل کروں گا اور یہی میری زندگی کا مقصد ہے اور مجھے خود پر بھروسہ ہے۔ اپنی قوت ارادی پر یقین ہے۔ میرے ارادوں میں لغزش نہیں اور جس انسان کے ارادے مضبوط اور دوسروں کی بھلائی کے لیے یکسو ہوتے ہوں وہ کبھی کمزور نہیں ہوتے۔ میرے بڑے بھائی صاحب نے فوج کا افسر بننے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ آج وہ فوج میں کپتان ہیں اور ملک کی سرحد پر ایک چٹان کی مانند کھڑے ہیں اور میرے ارادے بھی پختہ ہیں۔ اس لیے میں دوسرے محاذ پر بھی فتح حاصل کروں گا، جو میری زندگی کا مقصد ہے۔

☆☆☆

سگریٹ نوشی ایک لعنت

گو ابھی تک یہ شبہ ہی ہے کہ سگریٹ نوشی سے پھیپھڑوں کا کینسر ہو سکتا ہے روز بروز یہ شبہ پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیوں کہ اس شبہ کو تقویت دینے کے لیے کئی قسم کی شہادت موجود ہیں۔ یہ ایک ڈاکٹر کے الفاظ ہیں جو اس نے بی بی سی کے صحت کے متعلق ایک نشریے میں کہے تھے۔

ڈاکٹر نے آگے چل کر وضاحت پیش کی کہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ گزشتہ بیس سال میں کینسر کی دوسری قسموں میں کمی کی واقع ہوئی ہے۔ لیکن پھیپھڑے کے کینسر میں اضافہ زیادہ تر مرد مریضوں میں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس اضافے کی وجہ یہ بھی ہو کہ پہلے صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے پھیپھڑے کے کینسر ہمارے علم میں نہ آتے ہوں لیکن عام طور پر یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ دراصل میں پھیپھڑے کا کینسر پہلے سے زیادہ ہوا ہے۔ جس زمانے میں پھیپھڑے کا کینسر زیادہ بڑھا ہے اسی دوران سگریٹ نوشی کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ویسے یہ کوئی حتمی ثبوت نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس زمانے میں اور بھی بہت سی چیزوں کے استعمال میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ریفریجریٹر اور آئس کریم وغیرہ کا لیکن آپ نے اس دلیل کو اور گہرائی سے دیکھیں۔ جس لحاظ میں سگریٹ نوشی میں خاص اضافہ پایا گیا ہے۔ اور وہاں پھیپھڑوں کے کینسر کے مرض میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

چند سال پہلے امریکہ اور برطانیہ میں سگریٹ پینے والے کینسر کے مریضوں اور دوسرے امراض میں مبتلا لوگوں کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ پھیپھڑوں کے کینسر کے مریضوں میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو تقریباً بیس سال سے اوسطاً بیس یا اس سے زیادہ سگریٹ روزانہ پیتے رہے تھے۔ لیکن جو مریض دوسرے امراض والے تھے ان میں اتنی کثرت والے سگریٹ نوشی کے شوقین نہیں ملتے تھے۔ تو اس سے پتہ چلا کہ سگریٹ پینا پھیپھڑوں کے کینسر کا سبب ہے لیکن اس بات سے اس شبہ کو مزید تقویت ملی ہے۔ اور دونوں میں کچھ تعلق ضرور ہے۔ اور یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ کثرت سے سگریٹ نوشی سے تقریباً بیس سگریٹ روزانہ بیس سال کے قریب پینے سے یہ امکان بڑھ جاتے ہیں کہ انسان کی موت پھیپھڑوں کے کینسر سے واقع ہو۔

دے دیا۔ یہ علمی ادارہ نہایت ہی سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ اس کالج میں انگلستان کے بہترین اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور ادبی ترقی علی گڑھ ترقی کے اہم مقاصد تھے۔ جن کے حصول کے لیے سرسید نے ہر ممکن کوشش کی۔ اپنی زندگی میں ہی سرسید نے اس کالج کو یونیورسٹی میں بدلنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن تیس لاکھ روپیہ فنڈ کے بغیر حکومت یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

چنانچہ سرسید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجے تک پہنچانے کی کوششیں شروع کیں۔ مگر ان کی زندگی میں صرف آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ ان کی وفات کے بعد آغا خان نے بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ اور تیس لاکھ روپے اکٹھے کیے۔ اور 1920ء میں حکومت سے منظوری حاصل کر کے اس کالج کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ علی گڑھ نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوستانی قوم کو بیدار کرنے اور تعلیم یافتہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے کے لیے سرسید کے رفقائے کار، حالی، شبلی، نذیر احمد، آزاد، محسن الملک، مہدی علی، وقار الملک، مشتاق حسین، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، امیر علی، محمد اقبال، سید خدا بخش، اور آغا خان وغیرہ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک دراصل سرسید کے اس خواب کا نام ہے جس کی تعبیر ہمیں آج ہندوستانیوں کی زندگی میں عام اور مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں خاص دکھائی دیتی ہے۔ ابتداء میں یہ تحریک سرسید نے انفرادی سطح پر شروع کی تھی۔ لیکن بعد میں رفقائے کار ساتھ ملتے گئے اور ایک بڑا قافلہ بن گیا۔ علی گڑھ تحریک نے تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، ادبی، سماجی، سیاسی، اور تمدنی بیداری اور ترقی کے لیے نہایت اہم رول ادا کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی آج بھی وہی فرائض انجام دے رہی ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہاں آتے ہیں۔

☆

میری زندگی کا مقصد

یوں تو ہر انسان اپنے طور پر اپنی زندگی کے لیے ایک راہ اپنا کر اسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ کسی کا مقصد شاعر و ادیب بننا ہوتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر یا انجینئر، کوئی تجارت یا نوکر اور کوئی صرف تعلیم ہی اپنا مرکز بنا لیتے ہیں۔

میری زندگی کا مقصد: میں جب چھوٹا تھا تو میرے دماغ میں میری زندگی کا مقصد بھی صرف تعلیم حاصل کر کے کسی اچھی نوکری کو حاصل کرنا تھا۔ مگر جوں جوں تعلیم کی روشنی میرے اندر میرے دماغ میں داخل ہوتی گئی، میرا مقصد تو بدل گیا اور میرے خیالات بھی تبدیل ہوتے گئے۔ اور اب سوچتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا مصرف کتنا غلط سوچتا تھا۔ میں نے اب اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے کہ میں عمدہ تعلیم پانے کے بعد زراعت سے متعلق ڈگری حاصل کر کے اپنے گاؤں میں اپنے کھیتوں میں کام کروں گا۔ کھیتی کے لیے نئے طریقے اپنا کر اپنے گاؤں کا اور اپنے کھیتوں کا نقشہ بدل دوں گا۔ دراصل مجھے دیہات کی زندگی بہت پسند ہے۔ قدرتی ماحول میں مصنوعی سہاروں سے پرے انسان ایک آزاد پرندے کی طرح جدھر چاہے، جو خواہش کرے، وہ وہ کام کرے۔ کھیتوں میں دن بھر کام کر کے اور شام کو نہا دھو کر ایک ہی کنبے کے افراد کی مانند چوپال پر اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی باتیں کریں۔ میں اس بات کا ارادہ کر چکا ہوں کہ اپنے ملک سے بھوک کو ختم کرنے کے لیے زراعت کی پیداوار میں اضافے کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کر دوں گا۔ آج جب کہ ایک زبردست خطرہ کی آمد محسوس کر رہے ہیں۔ جس کا انسانیت سوز حملہ اور پاکستان کا غیر اخلاقی رویہ اور اس کے ساتھ ہی ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اناج کی ضرورت، ان حالات میں ملک کی اقتصادی و زرعی حالت کی طرف توجہ دی جائے یا دفاع کی طرف۔ اس سلسلے میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس ملک کے لوگ بھوکے ہیں، وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ دنیا میں ہندوستانی واحد قوم ہیں جو صرف چنے کھا کر دشمنوں سے لوہا لے سکتے ہیں۔ بہر حال خیال کے مطابق ہمیں دو محاذوں پر جنگ لڑنا ہے۔ ایک محاذ جنگ جہاں ہمیں اپنی آزادی کی حفاظت کرنا ہے اور دوسرا محاذ ہمارے کھیت ہیں۔ دوسری جنگ ہمیں اپنے کھیتوں میں لڑنی ہے اور بھوک کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنا ہے۔ میں نے اس مقصد کے لیے یہ سوچا کہ اپنے جیسے چند ایک دوسرے ہم خیال نوجوانوں کو ملا کر اس جنگ

"اگر یہ کالج ختم ہو گیا تو انگریزی علم داری ہندوستان سے اٹھ جائے گی"۔

مگر ان کی رائے کو اہمیت نہیں دی گئی اور 1854ء میں اس کالج کو فضول شے سمجھ کر بند کر دیا گیا۔ اس کالج کی خدمات نے اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا۔ اور جو نثری سرمایہ یہاں وجود میں آیا وہ ہمارے ادب کا انمول ذخیرہ ہے اور اس پر ہمیں ہمیشہ فخر ہے۔

☆☆☆

علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان تھے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کی خامیاں اور خوبیوں کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اُن کی ضرورتوں پر غور کیا۔ اور مصلحانہ کوششوں سے اُن کی یہ رہنمایانہ کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ انہوں نے مذہب، ادب، سیاست، تعلیم، معاشرت اور تاریخ غرض کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جملہ مسائل پر توجہ کی۔ یہاں تک 1857ء ہی مغلیہ دورِ حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کی حکمرانی کے آغاز کے دوران ایک خط امتیاز ہے مگر غدر 1857ء سے پہلے ہی اس کے آثار بہت نمایاں ہو چکے تھے۔ سرسید احمد خان ان باتوں کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ غدر کے بعد سرسید کے سامنے ہندوستان کے مستقبل کی بہت واضح تصویر آ گئی تھی۔

انقلاب نے سرسید کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ اور انہیں قوم کی تباہی و بربادی کا شدید احساس ہو گیا۔ انہوں نے قوم کو بیدار کرنے کے لیے انگریزی سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول پر زور دیا۔ چناں چہ 1968ء میں سرسید نے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ درجے کی تعلیمی علمی تہذیبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے اور ان لوگوں کو اس سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔ جو براہِ راست انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ہی صحیح معنوں میں علی گڑھ تحریک کے علمی اور ادبی کارناموں کا نقطہ آغاز ہے۔ اس لیے کہ سوسائٹی کے جو مقاصد اس وقت پیش نظر رکھے گئے تھے بنیادی طور پر یہی مقاصد سرسید اور ان کے رفقائے کار کے علمی و ادبی کارناموں اور علمی جدوجہد میں عرصہ دراز تک کارفرما رہے ہیں۔ سرسید نے 1849ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ لندن میں انہوں نے انگریزی نظامِ تعلیم، طرزِ معاشرت، طرزِ زندگی، اخلاقی اور سماجی طریقِ کار کا بغور مطالعہ کیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں واپسی پر آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر تعلیمی ادارہ کھولا جائے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کے لیے جو کوششیں کیں 1877ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد 8 جنوری 1977ء کو مدرسۃ العلوم کو M.A.O کالج کا

ٹیلی ویژن کے ذریعہ ایک استاد کے ہاں زبان دانی، جغرافیہ، تاریخ، سائنس، ریاضی، اقتصادیات، فلسفہ وغیرہ کا درس دے کر لاکھوں افراد کو مستفید بنا سکتا ہے۔ طلبہ کے لیے نہایت مفید باتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ لندن، پیرس، فرانس، برلن، نیویارک، ٹوکیو، قاہرہ، ممبئی، دہلی اور بنگلور کی گلیاں اور کوچے ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان جگہوں پر ہونے والے جلسے اور ہر واقعات ہم گھر بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی مقبولیت کا آج یہ حال ہے کہ ہندوستان کے ہر شہر میں ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کیا جا رہا ہے۔ جب کہ بڑے بڑے تمام شہروں میں ایسے اسٹیشن قائم ہو چکے ہیں۔ اصلاح معاشرت، تعلیمی بیداری اور امن و امان کے لیے بھی ٹیلی ویژن بڑے کام کی چیز ہے۔ ہندوستان میں مشترکہ زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ٹیلی ویژن ایک بہترین ذریعہ ہے۔

ٹیلی ویژن پر اچھے اور مفید پروگرام نشر کرنے سے معاشرے میں سدھار لایا جا سکتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تعلیم کے میدان میں ترقی کا واحد طریقہ ٹیلی ویژن ہوگا۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ درس و تدریس کا ایک عمدہ طریقہ رائج ہوا ہے۔ اس پر عوام کی زندگی کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔ عام معلومات اور صحت و صفائی کے اصول بیان کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن کا رواج اب ہماری ریاست میں عام ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن ریڈیو سے زیادہ تفریح کا سامان فراہم کرتا ہے۔ عوام کی دلچسپیوں کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کا نام دوردرشن رکھا گیا ہے۔ اس میں دوردرشن کی بڑی اہمیت ہے۔ دیگر میدانوں کے علاوہ تعلیم و تربیت کے میدان میں ٹیلی ویژن نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اور ابھی یہ اور ترقی کرے گا۔

☆☆☆

فورٹ ولیم کالج

ابتدا میں انگریز ہندوستان میں تجارت اور سیر و سیاحت کی غرض سے آئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ جعل سازی اور فریب سے ہندوستان کے حکمران بن گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعد انگریزوں کو ہندوستان کی زبانیں سیکھنے میں دقتیں پیش آنے لگیں اس لیے انگریز افسروں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے لارڈ ولزلی نے 1800ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر جان اعلیٰ تعلیم یافتہ فن قدرداں اور علمی ذوق شوق رکھنے والے فرد تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کالج کی ترقی دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ گو اس کالج کے قیام کے وجہ سے ہندوستان اس وقت رائج زبانوں کو حقیقی تقویت کی شاید ترقی ایک سو سال میں نہیں ہو سکی۔ خصوصی طور پر اردو نثر کی ترقی کا شاندار دور فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہی شروع ہوا۔ اردو زبان و ادب کے ارتقاء کے لیے اس کالج کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس کالج میں بہت سے شعبے رکھے گئے۔ کالج کے ساتھ بہت بڑا کتب خانہ اور ایک چھاپہ خانہ بھی تھا۔ کالج کی سرگرمیاں تقریباً 20 سال تک تیزی سے جاری رہیں۔ اٹھارہ مصنفین کام کرتے رہے۔ اور اس پچاس سے زائد کتابیں اردو میں لکھی گئی۔ جن کی زبان صاف، سادہ، سلیس، دلکش اور رواں ہے۔ ڈاکٹر جان ایک قابل، اہل علم، ہمدرد اور فرض شناس انسان تھے اور علم و فن کی قدر بھی کرتے تھے۔ اردو زبان سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ اس لئے انہوں نے ذاتی دلچسپی، توجہ اور محنت سے اردو زبان و ادب کو بہت بڑا فروغ دیا۔

فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کی طرف بھی توجہ دی گئی یہاں سنسکرت کے قصے بول چال کی زبان میں سنائے جاتے تھے۔ تاکہ اردو کے مصنف ان قصوں کو اپنی زبان میں لکھ لیں اور للو لال جی جو سنسکرت کے ماہر تھے اس کام میں مدد کرتے۔

فورٹ ولیم کالج لارڈ ولزلی کا لگایا ہوا ایک پودا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ برقرار رہے اور دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ انہوں نے ایک بار یہاں تک لکھا تھا کہ

تیسری عالمی جنگ کا خطرہ جتنا آج ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔ اس خطرے کو جنگی تیاریوں سے نہیں بلکہ امن کی طاقت سے روکا جا سکتا ہے۔ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ابھی تک جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر اس وجہ سے ناکام ہوئی ہیں کہ ایک ملک کو دوسرے پر اعتبار نہیں یا ان کے اندر نفرت کے جذبات اتنی گہری پھیلی ہوئی ہیں کہ وہ باہمی دوستی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز نے امن کے لیے جو مجلس بنائی تھی وہ بالکل بے کار ثابت ہوئی تھی۔ یو۔ این۔ او کی کوششیں لیگ آف نیشنز کے مقابلے میں زیادہ موثر تھیں۔ لیکن ابھی تک یو۔ این۔ او بھی امن کے لیے کوئی حتمی اور قطعی حل پیش نہیں کر سکی۔ دنیا آج بھی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ روسی بلاک اور امریکی بلاک جب تک دنیا کے تمام ممالک نئے اندر یکتا جذبہ نہیں پیدا ہوگا۔ اس وقت تک دنیا جنگ کے خطرے میں مبتلا رہے گی۔

دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے کسی عالمی طاقت کی ضرورت ہے۔ جو یو۔ این۔ او سے بھی زیادہ طاقتور ہو۔ جو جنگی اصول رکھنے کے لیے مکمل پابندی کر سکے۔ کیوں کہ جنگی اصول کی تیاریاں جب تک جاری رہیں گی جنگ کا خطرہ بھی منڈلاتا رہے گا۔ ایسی دھاکوں پر پابندی کی بھی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے زمانے میں ملکی اور نسلی تعصب ختم ہو جائے اور ایک عالمی حکومت بن جائے۔ جنگ کا خطرہ مکمل طریقے سے صرف اسی وقت ٹل سکتا ہے جب دنیا میں عالمی حکومت کا قیام ہو جائے۔ دیکھیں کبھی یہ خواب حقیقت بن جائے۔

☆☆☆

ٹیلی ویژن اور تعلیم

بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں سائنس نے دیگر علوم کی طرح کافی عروج حاصل کیا ہے۔ سائنسدانوں نے پرسکون اور خاموش طور پر اپنی ذاتی محنت اور کوشش کے بل بوتے پر ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک نوجوان سائنسدان انجینئر مسٹر جون بیرڈ نے اپنی تجربہ گاہ میں کافی محنت اور تجربے کے بعد ٹیلی ویژن میں بولنے والے کی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔ دیکھنے والے مقرر کی حرکت و سکنات بھی دیکھ سکتے ہیں جس کا دیکھنے والوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں دیگر کاموں کے علاوہ ٹیلی ویژن کو تعلیمی اور ترقی میدان میں ایک خاص اہمیت اور درجہ حاصل ہے۔ آج کل عوام میں ٹیلی ویژن کا رجحان عام ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں تقریباً گھر میں ٹیلی ویژن دکھائی دے گا، جو اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

ٹیلی ویژن ریڈیو کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس لیے ریڈیو سے زیادہ موثر ہے۔ ریڈیو کے ذریعے طلبہ کے لیے جو اسباق نشر کیے جاتے ہیں وہ نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ مگر ریڈیو کے ذریعہ طلبہ مقرر کی شخصیت کو نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ جس سے دیکھنے والے پر واقعی بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ دیکھنے والے مقرر کی شخصیت، انداز اور طرز گفتگو دیکھ کر نہایت متاثر ہوتے ہیں۔

ٹیلی ویژن تعلیم و تربیت کے لیے نہایت مفید ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ جو اسباق لیکچر یا ڈرامے یا پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، وہ نہایت متاثر کن اور شاندار ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سے ادبی، تعلیمی اور عام آگاہی کے لیے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ دیکھنے والے ٹیلی ویژن کا یہ پروگرام دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ وہ انسان جو دنیا میں تنہا آیا تھا اور بے سر مائی کی حالت میں تھا، آج کس قدر ترقی پا کر اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن جہاں تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے وہاں ٹیلی ویژن نے تعلیم کے میدان میں بڑے بڑے مفید اور اچھے کام انجام دیے ہیں۔ فلاح اور اصلاح کے علاوہ جو کام اس مفید ایجاد سے لیا جاتا ہے وہ زیادہ تر تعلیم کی اشاعت کا ہے۔ اب ہندوستان میں بھی ٹیلی ویژن سے زبان اور علم و ادب کی تبلیغ کا کام لیا جا رہا ہے۔

حادثات بہت ہوتے ہیں لیکن ان بے ضابطہ کھیل کھیلنے والے دوسرے کھلاڑی کو زخمی کر دینا گرا کر گیند چھین کر لینے کے متعلق نہایت سخت قانون بن گئے اور جب کھیل کے صحیح جذبے کے ساتھ فٹ بال کھیلی جاتی ہے تو حادثہ کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

عالمی امن

ہمارا زمانہ سائنس اور ایٹمی ترقی کا زمانہ ہے۔ ایٹم بم کی بے پناہ قوت آج ہمارے اشاروں پر کسی غلام کی طرح کام کرتی ہے۔ یہ طاقت ہم امن اور انسانیت کی ترقی کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور جنگ کے لیے بھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم کی طاقت کو جنگ میں استعمال کیا گیا تھا۔ ایٹم بم کے صرف دو دھماکوں نے لاکھوں انسانوں کو فنا کر دیا تھا۔ سینکڑوں میل تک پودے انسان اور حیوان خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور لاکھوں انسان ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گئے۔ لیکن موجودہ ہائیڈروجن بم ان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تباہ کن ہیں۔

دنیا کی کئی طاقتوں کے پاس ایسے بموں کے ذخیرے موجود ہیں اگر کسی جنگ میں ان میں سے چند بم بھی استعمال کیے گئے تو تمام دنیا اجاڑ اور برباد ہو سکتی ہے۔ موجودہ سیاسی حالات میں کسی بھی وقت تیسری جنگ عظیم چھڑ سکتی ہے۔ اور ہماری لاکھوں برس پرانی تہذیب اور تمدن اور زندگی کے آثار کو مٹا سکتی ہے۔ پریذیڈنٹ کینیڈی نے جنگ کے اسی خطرے کے متعلق کہا تھا کہ یا تو انسان کو ہمیشہ کے لیے جنگ کے امکانات کو ختم کرنا ہوگا ورنہ جنگ انسان کو ختم کر دے گا۔ اگر کچھ لوگ ایٹمی جنگ میں ہلاک ہونے سے بچ بھی گئے تو ان کی زندگی مُردوں سے بدتر ہوگی۔ ایٹم کی تباہی نے ملک قوم یا براعظم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ انسان اور حیوانات اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

جتنی ایٹمی اسلحہ کی تیاریاں بڑھ رہی ہیں، اتنا ہی ایٹمی جنگ کا خطرہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔ ہر وقت جنگ کا خوف ہمارے اوپر سوار ہے۔ پتہ نہیں کب دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے۔ اور انسان کا چاند پر پہنچنے کا خواب ادھورا ہی رہ جائے۔ یہ بات نہیں کہ جنگی طاقتوں کو ایٹمی جنگ کے نقصان کا اندازہ نہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ ایٹمی جنگ میں ہارنے اور جیتنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کیوں کہ ایٹمی جنگ کا نتیجہ دیکھنے کے لیے مشکل سے ہی کوئی انسان باقی بچے گا۔ اس لیے شاید ہی کوئی ملک ایٹمی جنگ کرنے میں پہل کرنے کی ہمت کرے۔ لیکن جنگ میں ہر چیز ممکن ہے۔ انسان بعض حالات میں دیوانگی کے فیصلے بھی کر سکتا ہے۔ کیا یہ جھوٹی عزت اور شان پر آنچ آتے دیکھ کر کوئی سر پھرا ملک ہائیڈروجن بم کا استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے۔

روک تھام ہو گئی اور بہت سی موتوں کی تعداد میں کمی آ گئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی آبادی کی سب سے بڑی وجہ شاید عوام کا مسئلہ فروغ آبادی سے غفلت ہے اور آبادی کی روک تھام کے طریقوں سے لاعلمی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ آبادی روک تھام کی کوششوں میں سنجیدگی سے حصہ لیتے ہیں اور آبادی کا مسئلہ خطرے کے نشان سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت کی دریافت کی گئی ہے۔ عوام کی معیارِ زندگی اور آبادی کا تعلق دوطرفہ ہے۔ یعنی آبادی بڑھتی ہے تو معیارِ زندگی گرتے ہیں۔ اور جب معیاری زندگی گرتے ہیں تو آبادی بڑھ جاتی ہے اور یہ چکر جب شروع ہوتا ہے تو اس کی روک تھام دنیا کا ایک سخت سے سخت ترین کام ہے۔

آبادی روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف حکومت کی کوششیں ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام بھی حکومت کا پورا پورا ساتھ دیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب عوام کو اس مسئلے سے پوری واقفیت ہو۔ اور وہ آبادی کے روکنے کے طریقوں پر دل سے عمل کریں۔ عام تعلیم لوگوں میں یہ شعور پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف سے اس مسئلے سے پیدا ہونے والی برائیوں کو دور کرنے میں حکومت اور عوام کو سخت جدوجہد کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ مزید آبادی نہ بڑھے اور ہندوستان دنیا کے سامنے سر اٹھا کر یہ کہہ سکے کہ ہمارے ملک میں کوئی بھوکا اور ننگا نہیں ہے۔

☆☆☆

میرا پسندیدہ کھیل

طالب علمی کی زندگی میں میں نے بہت سے کھیل کھیلے لیکن مجھے فٹ بال کا کھیل سب سے زیادہ پسند آیا۔ شروع میں میں نے کرکٹ کھیلنا شروع کیا لیکن اس کھیل میں مسلسل حرکت نہیں ہے۔ مجھے اس میں فٹ بال کے مقابلے میں آدھا لطف بھی حاصل نہیں ہوا۔ کرکٹ کے کھیل میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کھیل طالب علموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے یہ ایک قیمتی کھیل ہے۔ اس کا سامان بہت ہی مہنگا ہے۔ پھر میں نے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا تھوڑے دنوں میں اندازا ہوا کہ واقعہ لوگ سچ کہتے ہیں کہ یہ ایک لڑکیوں کا کھیل ہے۔ یہ اس قدر آسان ہے کہ وقت گذاری کا ذریعہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن کھیل کی سی ورزش اور محنت نہیں۔ البتہ ٹینس ایک اچھا کھیل ہے۔ اول تو یہ بھی قیمتی کھیل ہے۔ پھر اس میں تمام اعضاء کے جسمانی ورزش نہیں ہوتی۔ بچپن میں نے دیہاتی کھیلوں سے بھی دلچسپی لی۔ وہاں پر کبڈی کا کھیل دیکھ کر اس کی یاد اب تک میرے دماغ میں تازہ ہے۔ واقعی یہ دلچسپ کھیل ہے۔ اس میں کھیلنے والوں کو نہ صرف ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے بچاؤ کے لیے طریقے بھی خود ہی ایجاد کرنے ہوتے ہیں۔ کبڈی میں ایک کھلاڑی کو مخالف پارٹی کے جتنے کھلاڑی گھیر لیتے ہیں تو اس کو آزاد ہونے اور صحیح طور اپنی سرحد میں واپس آنے کے لیے نہ صرف پوری جسمانی قوت کرنی پڑتی ہے بلکہ دماغ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اس قسم کے کھیل پرانے زمانے میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس میں کوئی خرچ نہیں ہوتا، یہ اس کی بڑی خوبی ہے۔ لیکن یہ کھیل شہروں میں نہیں کھیلا جاتا اور چوں کہ شہر میں رہتا ہوں اس لئے مجھے فٹ بال میں بڑا لطف آتا ہے۔ جب سب کھلاڑی متحد ہو کر ایک مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی کوشش ایک قاعدہ کی پابندی ہوتی ہے۔ اس طرح کھیلنے والوں میں یک جہتی اور قاعدہ کی پابندی کی عادت ہوتی ہے فٹ بال میں مستعدی سے تیزی سے حملہ کرکے اس پر عمل کرنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ آتا ہے۔ ریفری کی سیٹی کی آواز پر ایک دم رک جانے کی عادت سے نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے اور ذرا سوچئے اس لمحہ کی خوشی جب گول ہو جاتا ہے۔ ٹیم خوشی خوشی جیت لیتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہارنے والی ٹیم کتنی خندہ پیشانی سے شکست کو قبول کرتی ہے۔ فٹ بال کے کھیل کے اوپر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں

سواریاں بنانے والے معاملے میں بھی ہندوستان پیچھے نہیں ہے۔ سائیکل سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سواریاں تیار کی جاتی ہیں۔ اب ہم کو باہر ممالک سے موٹر کاریں، لاریاں، وغیرہ منگوانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور کافی بڑی تعداد میں یہیں تیار کئے جاتے ہیں۔ صنعت کے معاملے میں ہندوستان کا شمار اہم ملکوں میں ہوتا ہے۔

میڈیکل سائنس میں بھی ہندوستان پیچھے نہیں ہے۔ ہر مرض کی دوا ہندوستان میں بن رہی ہے۔ بہت خاص قسم کی دوائیں ہیں جو ہم دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ یہاں دل و دماغ کے آپریشن بھی کامیاب ہو رہے ہیں۔ اور ایسے اور بہت سے بیماریوں کا علاج اب ہمارے ہندوستان میں موجود ہے۔ سائنسی ترقی سے ہندوستان میں کافی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

ہندوستان نے خلا میں سیٹ لائٹ (سیارہ) بھی چھوڑے ہیں۔ پہلا سٹیلائیٹ آریہ بھٹ تھا جو روس کے ایک خلائی اسٹیشن سے 19 اپریل 1975ء کو داغا تھا۔ اس سٹیلائیٹ کا بنیادی مقصد سٹیلائیٹ ٹیکنالوجی سسٹم کو زیادہ مستقبل منصوبوں کے مطابق اس ٹیکنالوجی کا تجربہ کرنا اور زمینی مراکز کے لیے سائنسی تجربوں کی راہ ہموار کرنا تھا۔ آریہ بھٹ اگرچہ ہندوستان کا پہلا سیارچہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہایت ترقی یافتہ اور بہت بڑے مقاصد کے لیے بھی موزوں و معاون ہے۔ اس کے بعد (Insat) یعنی Indian Sattelite System 1983ء میں قائم کیا گیا۔ یہ ایک کثیر المقاصد سیارچہ نظام ہے۔ جس کے ذریعے ملک کے اندر ٹیلی مواصلات موسموں کے حالات کے بارے میں اطلاعات اور اداروں کے قومی سطح پر براہ راست سٹیلائیٹ، ٹیلی ویژن کی تشہیر اور پروگرام کی نشریات کا کام ممکن ہو پاتا ہے اب تک اس نظام کے تحت کئی خلائی سٹیلائیٹ چھوڑے جا چکے ہیں۔ تمام سٹیلائیٹ خلائی تحقیق اور ٹیلی مواصلات کی دنیا میں انقلاب کا باعث ثابت ہوئے ہیں۔

میزائل ٹکنالوجی میدان میں ہندوستان نے پرتھوی، آکاش، اگنی، ناگ اور ساگر جیسے میزائل بناکر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان نے سائنس کے میدان میں کافی ترقی کر لی ہے۔ یہاں ہم کو بہت کم سہولتیں حاصل ہیں۔ مگر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے سائنسداں اپنی محنت سے اسے پورا کر لیتے ہیں۔ اور اب وہ دن دور نہیں جب سائنسی اعتبار سے ہندوستان کی گنتی دنیا کی ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگے گی۔

☆☆☆

بڑھتی ہوئی آبادی

ہندوستان کے مسائل میں آبادی کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ملکی وسائل اب تمام لوگوں کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں رہے۔ آبادی بڑھنے کا اثر ملک پر کئی طرح سے پڑتا ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی اور رہن سہن نیچا ہو جاتا ہے۔ ملک کے ترقیاتی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ بے روزگاری، مفلسی، اور استحصال میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی ملک کے ذرائع ایک مخصوص آبادی کے لیے ہی کافی ہو سکتے ہیں۔

جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جس کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا آج اس کا شمار دنیا کے غریب اور پسماندہ ملکوں میں ہوتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کا اثر ملکی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پڑتا ہے۔ انسان کی ضروریات میں سب سے اہم چیز غذا ہے۔ گذشتہ برسوں میں ملک میں غلے اور کھانے پینے کی چیزوں کی پیداوار میں اضافہ تو ضرور ہوا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں آبادی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ سب آدمی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ ایک آزاد ملک کے ہر آدمی کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے لیکن حالت یہ ہے کہ لوگوں کو سر چھپانے کے لیے مکان اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے بھی میسر نہیں ہے۔ نوکریاں بھی بڑھتی ہوئی آبادی کے مقابلے میں اتنی کم ہیں کہ قدم قدم پر بے کاری، بے روزگاری اور مفلسی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی سماجی برائیاں بھی پرورش پاتی ہیں۔ جن میں چوری، ڈاکہ زنی، آوارگی اور اخلاقی گراوٹ سب سے نمایاں ہیں۔ بھوک اور مفلسی کے نتیجہ میں صحت کا معیار بھی روز بروز گرتا جارہا ہے اور طرح طرح کی بیماریاں بھی روز افزوں ترقی پر ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس کی ایک قدرتی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بھارت کی آب و ہوا افزائش نسل کے لیے بہت سازگار ہے۔ یہاں کے رہنے والے جسمانی طور پر وقت سے پہلے بالغ ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کم عمری شادیوں کا رواج ہے۔ ایک وجہ نئی دواؤں اور ٹیکوں کی دریافت کا ہے۔ جس کی وجہ سے وبائی بیماریوں کی

جتنی کوشش درکار تھی۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے پناہ گزینوں کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔ ان کی وجہ سے بے روزگاری میں اور بھی جان آ گئی۔ بے روزگاروں میں اضافہ ہو گیا۔ پارلیمنٹ میں اس پر بحثیں ہوئی۔ سیاسی پارٹیوں نے کئی باتیں کہیں۔ 1950ء سے 1956ء تک حکومت ہند کو بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خرچ میں کمی کی گئی۔ خوراک کا مسئلہ دوسری طرف درد سر بنا رہا۔ بے روزگاری کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں ہر سال 15 لاکھ انسانوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ناقص ہے۔ لڑکے تعلیم حاصل کر کے بازاروں میں نوکری کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح ملک کی قومی دولت میں کمی آ رہی ہے۔ اچھے لوگ بے کار رہ رہے ہیں۔ بے روزگاری انسان کے کردار کو خراب کر رہی ہے۔ انسان کا وقار ختم ہو رہا ہے۔ بے روزگاری کے بڑھنے سے سیاسی خطرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے اندر حکومت کے خلاف آگ بھڑکتی ہے۔ پھر انقلاب آ جاتا ہے۔ لوگوں کا اعتبار حکومت پر سے اٹھ جاتا ہے۔

حکومت نے پنج سالہ پلان مرتب کیے ہیں۔ ان میں زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم، صحت، ذرائع آمد و رفت، ذرائع عامہ کی سکیمیں اور عوام کی ترقی منصوبے رکھے گئے ان سب سے ملک میں بے روزگاری کسی حد تک کم ہو گی۔ لیکن پھر بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

☆☆☆

بھارت میں سائنسی ترقی

آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان سائنس کی ترقی کے راستے پر لگ گیا ہے۔ اور سائنس کی ترقی سے مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو ایک اچھی زندگی بخشیں۔ ہمارا ملک جو صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ترقی کرتے کرتے ہندوستان اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ اپنی ضرورت کا سامان اور اچھے قسم کے ہتھیار بنا سکتا ہے۔ تاکہ اس کی مدد سے اپنے ملک کی حفاظت کر سکے۔ ہاں ابھی یہ ضرور ہے کہ ہم ایسا سامان بنا سکے جو دوسرے ملکوں کے سامان کا مقابلہ کر سکے۔ مگر یہ بات بھی ہمارے لیے باعث فخر ہے اتنے کم عرصے میں ہمارے ملک میں اتنی ترقی ہو گئی ہے۔

کھیتی باڑی کے معاملے میں بھی سائنس سے بڑی مدد ملی ہے۔ اس کی مدد سے بہت اچھی قسم کی کھاد بنائی گئی ہے اس درمیان میں کارخانے کھولے گئے ہیں۔ جو کہ سائنسی اوزار بناتے ہیں۔ کھیتی باڑی کی ترقی کے سلسلے میں نئے نئے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ طرح طرح کے تجربے کیے جاتے ہیں۔ غلے کے ایسے بیج پیدا کیے جاتے ہیں جن کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بوائی کے نئے نئے طریقے معلوم کیے جاتے ہیں۔ ہماری فصلوں کو جو کیڑے نقصان پہنچاتے ہیں ان کو مارنے کے لیے دوائیں تیار کی گئی ہیں اور اب ہندوستان اس قابل ہو گیا ہے کہ اسے کھانے پینے کا سامان باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں بہت سے کارخانے کھولے گئے ہیں اس معاملے میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ اب ہندوستان کی گنتی دنیا کے 9 صنعتی ملکوں میں ہونے لگی ہے۔ بہت سے ممالک جن کو ابھی آزادی ملی ہے وہ صنعتی معاملات میں ہندوستان سے مدد لے رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بہت سارے فولاد کے بجلی کے سامان اور تیل صاف کرنے کے کارخانے لگائے گئے ہیں۔ ہمارے کارخانے بہت عمدہ کپڑا بھی تیار کر رہے ہیں۔ اس ملک کا کپڑا دوسرے ممالک میں مشہور ہے اور کسی بھی دوسرے ملک کے کپڑے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے کارخانے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹرانسسٹر، ٹیلیفون، کمپیوٹر، موبائل فون بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ بھاری مشینوں میں ڈیزل سے چلنے والے انجن، بجلی سے چلنے والے پمپ بھی عام ہو چکے ہیں۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غریبی اور بدحالی کو دور کرنے کے لیے حکومت اور عوام دونوں کو جدوجہد اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کے دستور میں عوام سے اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ حکومت ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ویسے بھی عوامی حکومت یا جمہوریت اسی وقت اپنے نام کی اہل قرار دی جا سکتی ہے جب وہ اپنے عوام کو زندگی کی لازمی ضروریات کو پورا کرنے کا حق دے سکتے ہیں۔ مہنگائی روکنے کے لیے حکومت کو اپنے تمام وسائل اور قوت سے کام لینا چاہیے۔ اور بلیک کرنے والوں، رشوت خوروں اور بے ایمانی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جانی چاہئیں۔ کیوں کہ اگر جلد ہی موثر اقدامات نہیں کیے گئے تو یہ مسئلہ اتنا بڑھ جائے گا کہ اس پر قابو پانا ممکن نہ ہو سکے گا۔ مہنگائی کی وجہ سے ایک طرف تو حکومت کے بہت سے ترقیاتی منصوبے عمل میں نہیں آ پاتے اور دوسرے ملک میں بے اطمینانی اور جگہ جگہ حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہوتے ہیں جو تخریبی کارروائیوں سے ملک کی تخریب اور ضائع ہوتا ہے۔ اور ترقی کے منصوبے سست اور بے عمل ہو جاتے ہیں۔ حکومت ابھی تک موثر اقدامات کرنے سے قاصر رہی ہے۔ لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ عوام نے حکومت کو اس سلسلے میں مناسب تعاون نہیں دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قانون اور حکومت ہی منافع خوروں کو سزا دے سکتی ہے۔ لیکن کیا یہ عوام کا فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو قانون کی نظر میں لائیں۔ پُر امن طریقوں سے ذخیرہ اندوزوں وغیرہ کو بے نقاب کریں۔ اور ان کا سماجی بائیکاٹ کریں۔ اگر عوام اور حکومت دونوں اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح اور خلوص اور لگن سے انجام دینے کی کوشش کریں تو وہ دن دور نہیں جب ایک بار پھر ملک میں خوشحالی کا سورج چمکے گا۔

☆☆☆

بیروزگاری کا مسئلہ

بے روزگاری کا خیال آتے ہی متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کی بے روزگاری کا خیال ذہن میں آ جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے روزگاری کوئی بھی ہو، اگر کسی مزدور، کسان، ڈاکٹر، انجینئر، کلرک کو نوکری صلاحیت کے باوجود نہیں مل رہی ہو تو بے روزگاری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بے روزگاری کے مسئلہ پر سوچنا پڑتا ہے۔ یہ بات یہاں تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ افسوس کی بات ہے کہ ایک آزاد ملک میں رہنے کے باوجود کوئی بھی شخص بے روزگار رہے۔ دوسری جنگ کے قبل بے روزگاری ایک مہلک بیماری کی طرح ہمارے سماج میں پھیل رہی تھی۔ لکھے پڑھے لوگوں کے لیے تو اور بھی مصیبت تھی۔ بے روزگاری کی وجہ سے افلاس، بھوک، مرض اور موت ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کتنی زندگیاں لٹ گئیں، کتنے خاندان برباد ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل بھی کوئی ایسی ہی بات تھی جس کے لوگ شکار ہو رہے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی بے روزگار لوگوں کو نئی صبح مل گئی۔ بے روزگاری کے لیے دوسری جنگ عظیم ایک رحمت بن کے آئی۔ بہت سے لوگوں کو جنگ کے سلسلہ میں نوکری مل گئی۔ پڑھے لکھے اور ان پڑھ دونوں نوکری کرنے لگے۔ یہ سلسلہ 1945 تک رہا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی پھر یہ بیماری پھیل گئی۔ بے روزگاری کا مسئلہ ایک بار پھر بھوت بن کر سامنے آیا۔ بہت سے فوجی ادارے بند کر دیے گئے۔ بہت بے کار ہو گئے۔ تجارت کی حالت خراب ہوئی اور لوگ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ ان کی زندگی کو سہارے کی ضرورت تھی۔ لوگوں کو ایک قسم کی آگ لگ گئی۔ ہر جگہ ہڑتال ہونے لگی۔ حکومت کے کام ٹھیک طور پر نہیں ہوئے۔ ایک تو ہزار طلبا ہر سال یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر آتے۔ اور پھر جنگ سے ہٹائے گئے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ ایک تماشہ ہو گیا۔ بہت سارے بے روزگار لوگوں نے خودکشی کر لی۔ وہ اپنی زندگی کی تلخیوں کو برداشت نہیں کر سکے۔ اس طرح بے روزگاری سماج کو چیلنج کرنے لگی اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرے اور اس سے لڑے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے سامنے بے روزگاری کا مسئلہ اہم رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومت نے اس مسئلہ کو سلجھانے کی انتھک کوشش نہیں کی ہے۔

کے کام آتی ہے۔ جاڑوں میں روم ہیٹر سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے موجودہ صنعتی ترقی میں تیز رفتار مشینوں کا اہم رول ہے کم محنت اور کم خرچ میں اچھا کام ہو سکتا ہے۔ سائنس کی ترقی نے ہماری زندگی کو دلچسپ اور تفریح کے سامان بھی دیے ہیں۔ سنیما، ٹیلی ویژن پر چلتی پھرتی تصویریں اور خبریں دیکھ سکتے ہیں۔

سائنس کا ایک بڑا حصہ یہ بھی ہے کہ اس نے ہمارے سوچنے کا ڈھنگ بدل دیا ہے۔ سائنس ہر بات کی وجہ اور حل بتاتی ہے۔ غرضکہ سائنس نے انسان کو وہ ہمت اور طاقت دی ہے کہ وہ اپنا ماحول اپنی ضرورت کے لحاظ سے بدل سکتا ہے۔

☆☆☆

بڑھتی ہوئی مہنگائی

آج کے زمانے میں کوئی ہے جو بڑھتی ہوئی مہنگائی سے پریشان نہیں۔ ویسے تو مہنگائی ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ دُنیا کے سبھی ملکوں میں ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑی حد تک یہ ایک فطری امر بھی ہے۔ کیوں کہ دُنیا کی آبادی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس رفتار سے چیزوں کی پیداوار میں نہیں ہوا۔ اور یہ بھی بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ جب کسی چیز کے خواہش مند یا طلبگار زیادہ ہو جائیں تو اس کی قیمت بڑھنا لازمی امر ہے۔ دُنیا میں لوہے، کوئلے اور پٹرول وغیرہ کے ذخیرے بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کے پیشِ نظر جس تیزی سے استعمال میں آرہے ہیں۔ اتنی تیزی سے نئے ذخیروں اور وسائل کی دریافت نہیں ہو سکی۔ غرض یہ چند عام حقائق ہیں جو دُنیا کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کو سمجھنے میں ہمیں مدد دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں مہنگائی کا مسئلہ دُنیا کے سبھی ملکوں سے زیادہ شدید اور تشویشناک ہے۔

ہندوستان بنیادی طور پر غریب اور پسماندہ ملک ہے جو آزادی ملنے کے بعد سے ترقی کی جدوجہد میں مصروف ہے لیکن ہماری ترقی کے تمام منصوبے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی، غریبی اور ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کی کمی وغیرہ کی وجہ سے پوری طرح عمل میں نہیں آپاتے۔ جس ملک کی بیشتر آبادی کو دو وقت پیٹ بھرنے کو اناج نہ مل سکے۔ وہاں پر مادّی ترقی اور تہذیب وتمدن کی بہتری کی باتیں ایک کرب ناک مذاق ہی معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال ان مسائل کو دور کرنے کے لیے ملک کو بہت بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ اور جی توڑ کر کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں جو اقدامات اور کوششیں کی گئیں ان میں سے زرعی پیداوار، صنعتی ترقی اور بے روزگاری ختم کرنے کے منصوبے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں ان منصوبوں کی ترقی کی رفتار دیکھ کر یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ جلد ہی ملک خود کفالتی کے راستے پر پوری طرح گامزن ہو جائے گا۔ غریبی میں کمی کی بجائے بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ آج ہندوستان میں بھوک، مفلسی اور بدحالی کا مسئلہ جتنا اہم ہو گیا ہے۔ شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر جمہوریت اور سوشلزم کے بلند بانگ دعوے اور ملکی رہنماؤں کے وعدے عوام کے لیے ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

نہیں کرسکتی۔ ہماری حکومت نے بھی کچھ اس قسم کے قدم اٹھائے ہیں جس سے اس کے قدم اٹھائے ہیں جس سے اس کو ختم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سرکاری ملازموں کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا ہے۔ کہ اگر وہ اپنی شادی میں جہیز لیں گے تو یہ حکومت کے قوانین کے خلاف ہوگا۔ پنجاب اور اتر پردیش کی حکومت نے اس پر کافی سخت قدم اٹھائے ہیں۔ انھوں نے تو شادی میں کھانے میں جانے والے لوگوں کی تعداد مقرر کر دی ہے۔ جس سے یہ کہ دعوت دینے والے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ درحقیقت اس کو ختم کرنے کا کام نوجوانوں کو شروع کرنا چاہیے۔ اور نوجوان مردوں عورتوں کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف فلمیں دکھائیں اور ڈرامے پیش کریں۔ جو جہیز کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کے خلاف سخت قسم کے قانون پاس کرے۔ ہمیں اس کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہیے تاکہ لوگ خود اس سے پرہیز کریں اور غریب غربا کو اپنی لڑکیوں کی شادیوں میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

☆☆☆

روزمرہ زندگی میں سائنس

آج جس دور میں ہم رہ رہے ہیں، اس کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ سائنس ہماری زندگی میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اب بغیر سائنس کے پل بھر بھی ہمارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے استعمال کی ہر چیز کا سائنس پر انحصار ہے۔ ہماری ترقی کا تمام دارومدار سائنس پر ہے۔ آج جو آرام و آسائش کا سامان ایک عام آدمی کو حاصل ہے وہ پہلے بادشاہوں کو بھی میسر نہ تھے۔ کارخانے کے بنے ہوئے کپڑے، بجلی کی روشنی، ریڈیو، ٹیلیفون، سینما، ریل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل، گاڑی، جہاز، کھانے پینے کی اشیا سب کا استعمال عام ہے۔ پرانے زمانے کے راجاؤں اور مہاراجاؤں نے خواب میں بھی ان چیزوں کو دیکھا یا سوچا ہوگا۔ اگر کہیں گذرے ہوئے زمانے کے لوگ ہماری دنیا کو دیکھتے تو حیرت سے پاگل ہو جاتے۔ پہلے جو باتیں قصے کہانیوں میں ملتے تھے، ان کو سائنس نے سچ کر دکھایا ہے۔ اڑن کھٹولہ آج پریوں کی کہانیوں سے نکل کر ایک جیتی جاگتی تصویر حقیقت بن کر ہوائی جہاز آپ کے سامنے ہے۔ ہوائی جہاز نے آواز کی رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر چند گھنٹوں میں طے کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے ایک ملک سے دوسرے ملک تک کوئی پیغام بھیجنے میں ہفتے اور مہینے لگ جاتے تھے پھر بھی یہ ضروری نہ تھا کہ پیغام منزل تک پہنچ ہی جائے۔ آج ریڈیو، ٹیلی ویژن اور موبائل نے خبر رسانی کا کام ہزاروں میل ایک لمحے میں بات کر سکتے ہیں۔ ویڈیو کال موبائل سے ہزاروں میل دور ہونے سے بھی چہرہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔ پہلے چاند ستاروں کے متعلق من گھڑت کہانیاں اور قصے کہے جاتے تھے لیکن اب تیز رفتار خلائی جہازوں نے ان کی سطح کو چھو لیا ہے۔ کیمرے کی آنکھ نے ان کی تصویریں کھینچ کر ہمیں اصل حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔ وہ دن اب دور نہیں جب انسان چاند ستاروں کی دنیا کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ سکے گا۔

سائنس کی ایجادوں میں بجلی کی دریافت اور استعمال ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بجلی انسان کی سب سے بڑی خدمات گار ہے ہمارے مشکل سے مشکل کام بجلی منٹوں میں کر دیتی ہے۔ ہماری زندگی کے آرام و آسانیاں بجلی سے ہیں۔ بجلی ہمارے گھروں کو، سڑکوں کو روشن کرتی ہے۔ ہمارے موبائل چارج کرنے کے کام آتی ہے۔ کمپیوٹر چلانے

جہیز ایک سماجی لعنت

ہمارے سماج میں جہیز ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ جہاں اور بہت بڑے رسم و رواج وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مثلاً ستی کی رسم، بچوں کی شادیاں اور کسی حد تک چھوت چھات وغیرہ کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر یہ جہیز کی رسم وقت کے ساتھ کچھ اور بھی زیادہ پروان چڑھ رہی ہے۔ پہلے زمانے میں رسم کچھ اس طرح سے تھی کہ لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے اپنی لڑکیوں کو جہیز دیتے تھے۔ ان کو اس قسم کا سامان دیتے تھے کہ جس سے وہ اپنا گھر بسا سکے۔ مگر رفتہ رفتہ جہیز دینا ضروری ہو گیا۔ اب لڑکا اور اس کے ماں باپ اپنی مرضی سے جہیز مانگتے ہیں۔ اور یہ لوگ جہیز دینے کے بعد شادی طے کرتے ہیں۔ ویسے تو جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ رسم بہت پرانی ہے۔ رامائن میں بھی بتایا گیا ہے کہ رام چندر جی اور ان کے بھائیوں کی شادیاں ہوئی تھیں تو ان کی بیویوں کے والدین ان کو تحفے دیتے تھے۔ ان تحفوں میں زیورات اور ہیرے وغیرہ دیے تھے۔ جہیز کا رواج ہندوستان سے ختم نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں عورتوں کو مردوں کے مقابلے کمتر سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ لڑکے کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر سمجھتا اور لڑکے کا باپ اگر کسی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے لیے پسند کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ لڑکی کے باپ پر احسان کر رہا ہے۔ اور اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے جہیز دیا جاتا ہے۔ اس بات کا بہت کم لوگوں کو احساس ہے کہ خدا کی نظر میں مرد اور عورت کی حیثیت ایک ہی ہے اور عورت کو مرد کے مقابلے میں کم سمجھنا گناہ ہے۔ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ وہ اپنے حقوق کو نہیں سمجھتی ہیں۔ ان کے سسرال کے لوگ جو باتیں انہیں بتاتے ہیں وہ انہیں پر چلتی ہیں اور اسے ہی اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ جہیز کا نہ ختم ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مالی اعتبار سے بھی عورتیں مردوں کی آمدنی پر گزارہ کرتی ہیں۔ مرد روپیہ کا، روٹی کا انتظام کرتا ہے۔ اس کو خیال ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی بچی کے لیے روٹی فراہم کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہ جہیز مانگتا ہے۔ اور اس بات کو سمجھتے ہوئے لڑکی کا باپ جہیز دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جو لوگ جہیز کی موافقت کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ باپ کی جائیداد کا کچھ حصہ لڑکی کو ضرور ملنا چاہیے۔ ویسے

ان لوگوں کے اس خیال میں پختگی نہیں ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو ایک نیا گھر ملتا ہے اور لڑکے کو بیوی ملتی ہے جو کہ اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ دونوں کی ضروریات برابر ہیں جس میں دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مگر جہیز کی اس وجہ سے عورتوں کو سماج میں وہ عزت حاصل نہیں ہے جو کہ مردوں کو ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر عورتیں احساس کمتری کا شکار رہتی ہیں۔ اس کا اثر ان کی ساری زندگی پر پڑتا ہے۔ ان کے گھروں کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آج کل جب اخبار اٹھائے تو آپ کو کوئی نہ کوئی ایسی خبر ضرور نظر آئے گی جس میں لکھا ہوگا کہ لڑکی نے سسرال والوں کے برے سلوک سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ یہ سب کچھ جہیز کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب لڑکے والوں کو توقع سے کم جہیز ملتا ہے تو وہ لڑکی کو ہر طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ ان کے برے سلوک سے تنگ آ کر اکثر لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی بہوؤں کو زندہ جلا دیتے ہیں۔ اور ان کا قصور صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ زیادہ جہیز کیوں نہیں لائیں۔ کچھ والدین اپنی لڑکی کا جہیز تیار کرنے کے لیے اپنی ساری جائیداد لگا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی ساری آمدنی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی بچیوں کو تعلیم سے محروم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے بہت سے ذہین دماغ ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ ذہن جو آگے چل کر ملک کی ترقی میں بہت مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ لوگ جن سے صرف لڑکیاں ہوتی ہیں اور لڑکے نہیں ہوتے بدقسمت سمجھے جاتے ہیں۔ اگر اس رسم کو ختم نہ کیا گیا تو پتہ نہیں اس سے ہمارے سماج کو اور کتنا نقصان پہنچے گا۔

ویسے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حالات سے فائدہ اٹھا کر ایسے ثابت قدم اٹھائیں جس سے کہ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پایا جا سکے۔ اس سے چھٹکارا پانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں میں تعلیم پھیلائی جائے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر کی تعلیم دی جائے۔ عورتوں کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جائے اور ان کو اس بات کا بھی احساس دلایا جائے کہ سماج کو بنانے سنوارنے میں ان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ عورتوں کو نوکریاں دی جائیں۔ عورتوں کے نوکریاں کرنے سے بھی جہیز کی رسم میں کمی آئے گی۔

ویسے اب ہمارے سماج کے روشن خیال لوگ اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اور وہ اس کو پوری طرح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لڑکے عہد کر رہے ہیں کہ وہ اپنی شادی میں کوئی جہیز نہیں لیں گے۔ اور یہ سچ ہے کہ اگر ملک کے پڑھے لکھے نوجوان آگے بڑھیں اور اس رسم کو ایک بار ہمارے سماج سے ختم کر دیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو دوبارہ قائم

حاصل کرنے کی ہوس ہے۔ قحط، سیلاب، بے روزگاری بھی قومی مسئلے نہیں، سیاسی پارٹیوں کی چالوں کے معاملے بن جاتے ہیں۔ وزیر جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ مجالس قانون ساز کے ممبروں کا کوئی اصول نہیں۔ آج اس پارٹی میں ہیں، کل دوسری پارٹی میں اور اگر پہلی پارٹی میں پھر ترقی کے امکانات دیکھے تو پھر اس میں واپس آ جاتے ہیں۔ ہمارے دفتروں میں کام کم ہوتا ہے۔ باتیں زیادہ، ہماری ریلیں، ہمارے ڈاک گھر سب سستی اور کاہلی کے شکار ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان اور جرمنی جیسے ملک تباہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے محنت اور لگن سے پھر خوشحالی حاصل کر لی۔ ہم نے تعلیمی اداروں میں جن قدروں کا پرچار کرتے ہیں ان کو عملی دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا۔ آج ہمارے ملک میں کسی طرح کامیابی دوسروں کو دھکا دے کر حاصل کی جاتی ہے۔ آگے بڑھنا، چالبازی، دوسرے کا حق مار کر روپیہ بٹورنا عام ہے۔ مغرب سے ہم نے ان کی خرابیاں لے لیں۔ ان کا علم و حکمت کی لگن خدمت خلق کا جذبہ اور سماجی دستور نہیں لیا۔ پرانی تہذیب کی انسانی دوستی اور رواداری کو ہم بھول گئے۔ اس کی فرسودہ رسم و رواج اور اس کی توہم پرستی کو یاد رکھا۔ آزادی کے بعد دنیا کو ہم سے کتنی امیدیں تھیں اور خود ہم نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ لیکن آج ان امیدوں اور خوابوں کا کیا حال ہے۔ کیا عام لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ معقول بات کوئی نہیں سنتا اور جب تک کوئی ہنگامہ نہ کیا جائے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ہمارے وہ ادیب اور شاعر وہ دانشور اور سائنسدان کہاں ہیں، جنہیں قوم کا ضمیر کہا جاتا تھا۔ ہمارے ملک میں آج کوئی اقبال نہیں ہے۔ کسی کے ذاتی مفاد پر آنچ آئے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے مگر قومی مفاد کا خون ہوتے ہوئے سب دیکھتے ہیں اور پرزور احتجاج بھی نہیں کرتے۔ ان حالات میں نئی نسل جسے اپنے بزرگوں سے جنت کے بجائے جہنم ملا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ ورثہ اب سیاسی پارٹیوں کے آگے بچاؤ کا نہیں رہا۔ انتظامی کارروائیوں سے اسے حل نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس کے ڈنڈوں کے ذریعے سے طلبا کے غصہ کا علاج نہیں ہو سکتا۔

اس کے لیے ضرورت ہے کہ طلبا سے قریبی رابطہ قائم کیا جائے۔ ان کی نفسیات کو سمجھا جائے۔ ان کے لیے روزگار مہیا کیا جائے۔ ملک کو سرمایہ داروں اور چالاک سیاست دانوں کی لوٹ مار سے بچایا جائے۔ ہر ذمہ دار آدمی اپنے فرض کو بجا لائے۔ پھر دوسروں سے اس کام کے متعلق پرسش کرے۔ طلبا کو راہ راست پر استاد لاتے ہیں۔

مگر استادوں کو اس کام کے لیے اپنے قول سے اٹھنا ہوگا۔ انہیں ایک طرف سے اپنے فرائض منصبی پر پوری توجہ

کرنی ہوگی۔ دوسری طرف اچھے افسروں اور سیاست دانوں سے منوانا ہوگا کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی روشنی میں محنت اور خدمت کی راہ اختیار کریں۔ ذاتی منفعت اور فرعونیت کی روش ہمیشہ کے لیے ترک کریں۔ وہ ملک کا محافظ ہے۔ سیاست دان اور افسر اب تک اس آگ کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور اپنی بانسری بجا رہے ہیں۔ استادوں کو ہمت کر کے دل ہاتھ میں لینا چاہیے اور حکومت اور سماج کو راہ راست پر لانا چاہیے۔

☆☆☆

نقیب بھی ہے اور علم بردار بھی۔ آج کے دور میں ترسیل و ابلاغ کے میدان میں صحافت اب ایک حیران کن اور دل چسپ پیشہ بن چکا ہے۔ اس کے مقاصد سیاسی، سماجی اور کاروباری زندگی کی ترجمانی تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اس کے عظیم مقاصد میں عوام کی ذہنی و فکری تربیت بھی شامل ہے۔ صحافت ایک انتہائی دل کش ذریعۂ روزگار ہے۔ دنیا کی اہم ترین اور عظیم ترین شخصیتوں نے اس باوقار پیشہ کی طاقت اور امکان کا اعتراف کیا ہے۔ صحافت ترقی کی نقیب اور مستقبل کی تصویر ہے۔

موجودہ دور میں تو ہندوستان بھر میں ہزاروں اردو اخبارات، ماہنامے، رسالے، میگزین، فلمی، ادبی، سیاسی، انقلابی، اقتصادی وغیرہ ہر قسم کے اخبار شائع ہو رہے ہیں جن سے اردو ادب مالا مال ہو رہا ہے۔

☆☆☆

طلبہ میں انتشار

افسوس کا مقام ہے کہ طلبا میں آج جو بے چینی ہے، اس کے اسباب پر غور کم ہوتا ہے۔ اس کی مذمت کر کے لوگ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی سنجیدہ آدمی طلبا کے تشدد کی تائید نہیں کرتا اور وہ اگر ہنگامے کریں یا توڑ پھوڑ کی کارروائی کریں، یا قومی دولت برباد کریں تو لازم ہے کہ ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے۔ مگر ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ان کے اندر سماج کے خلاف، اپنے بزرگوں کے خلاف، ارباب اقتدار کے خلاف اس قدر غصہ اور برہمی کیوں ہے؟ طلبا ہمارے سماج کا سب سے احساس طبقہ ہیں۔ سماج کی خرابیوں پر بڑھتے ہیں۔ یا تقریر کرتے ہیں یا کتابیں لکھتے ہیں یا اپنے زمانے کی قدروں کی یاد تازہ کرتے ہیں یا اس سے کام نہیں چلتا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نوجوانوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کے برہمی، بیزاری اور بے راہ روی کی وجہ کیا ہے؟ دراصل ہم نے آزادی کی جدوجہد جن آدرشوں کو ساتھ لے کر کی تھی۔ انھیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آزادی کی ذمہ داریاں کم مل کر بہت کم لوگ پوری کرتے ہیں۔ ہم نام جمہوریت، سیکولرازم تہذیب اور انسانیت، مساوات اور سماجی انصاف کا کام لیتے ہیں۔ مگر ہمارے عمل سے ان قدروں کی تائید کم ہوتی ہے۔ ہم نے سوشلزم کو منزل مقصود قرار دیا ہے۔ مگر ہم منافع خوروں، اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کو برابر چھوٹ دیتے ہیں۔ ہم جب یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ نفع خوروں کو شاہراہ عام پر سزا دی جانی چاہیے تو کیا ہم نفع خوری کو روک سکتے ہیں۔ ہمارے منصوبے کاغذ پر زیادہ ہوتے ہیں۔ عمل میں کم آتے ہیں۔ ہماری تعلیم بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہے۔ ہمارے انجینئر بے کار پھر رہے ہیں۔ ہمارے گریجویٹوں کو کلرک کی نوکری نہیں ملتی۔ زیادہ تر لوگ اپنے مفاد کی یا اپنے کنبے اور برادری کے مفاد کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ملک کے مفاد کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے۔ ہم میں روز بروز قومی حمیت، غیرت کم ہوتی جاتی ہے اور دوسرے ممالک سے بھیک مانگنے میں شرم ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے استاد ترقی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارے کلرک پورے پیسے اور آدھے کی سوچتے ہیں۔ ہماری سیاسی پارٹیوں کو صرف اقتدار

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات کے لیے وقف تھا۔ "تاریخِ بغاوتِ ہند" کے بعد ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے جاری ہوا جس نے علی گڑھ کو ہندوستان کے نہ صرف صحافتی بلکہ سیاسی نقشے کا روشن ستارہ بنا دیا۔ اس کے بانی سماجی اصلاح کے داعی اور فروغِ تعلیم کے مشنری سر سیّد احمد خاں تھے۔ انھوں نے یہ اخبار اپنی علمی مجلس "سائنٹفک سوسائٹی" کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لیے جاری کیا۔ لیکن اس کی نوعیت نمایاں طور پر سیاسی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کے مطابق "اس اخبار کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ اس کے لیڈنگ آرٹیکل سر سیّد احمد خاں خود لکھتے تھے۔

"سائنٹفک سوسائٹی" میگزین اور "تہذیب الاخلاق" نے صحافت کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اسی زمانے میں لاہور سے "اخبارِ عام" اور "رہبرِ ہند"، الٰہ آباد سے "قیصر الاخبار"، دہلی سے "اکمل الاخبار" اور آگرہ سے "حیاتِ جاوداں" اور "آگرہ اخبار" جاری ہوئے جو مجاہد اخباروں کی صف میں تو شامل نہیں تھے لیکن تحریکِ آزادی سے ہم سفر رہے۔ لیکن ان موضوعات کی تیز تر عکاسی کرنے والا اخبار ہفت روزہ "اودھ پنچ" تھا جسے منشی سیّد محمد سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری کیا۔ "اودھ پنچ" کا انداز سب سے الگ اور منفرد تھا۔ یہ پہلا اردو اخبار تھا جس نے کارٹون کو رائے زنی کا ذریعہ بنایا اور مخالف کو نیچا دکھانے کی نئی راہ نکالی۔

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کے بعد اردو اخبارات کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ بہر حال اس بغاوت کے ۲۸ سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے اس کی مرکزیت کی زمین ہموار ہوگئی۔ اہلِ سیاست کو ایک مشترکہ اور کُل ہند پلیٹ فارم مل گیا۔ نئے رُجحان کو فروغ دینے والی کانگریس کے شرکاء میں سرکار کے خطاب یافتہ اور وفادار لوگ کثرت سے شامل تھے۔ اس زمانے میں اردو اخبار زیادہ تر صوبہ جات متحدہ (اتر پردیش) اور پنجاب سے شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ صوبہ جات متحدہ میں "اودھ پنچ"، "شحنۂ ہند" اور "مہرِ نیم روز"، پنجاب میں "ملا دو پیازہ"، "چچا خاں"، "رہبرِ ہند" اور "پیسہ اخبار" اور بنگال میں "دار السلطنت"، "گائیڈ" اور "الہدیٰ" نے علی گڑھ کے موقف کی حمایت کی۔

۱۹۱۲ء میں بنگال کے ایک انقلابی نوجوان مولانا ابوالکلام آزادؔ نے کلکتہ سے "الہلال" نکالا۔ یہ ایک انقلابی اخبار تھا جس نے سیاست، مذہب اور معاشرت پر بے باکانہ تنقید کی۔ ۱۹۱۲ء ہی میں بجنور سے "مدینہ" کی اشاعت شروع ہوئی۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ سے "ہمدم"، دہلی سے "ہمدرد" اور کانپور سے "آزاد" جاری ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے "البلاغ" نام کا دوسرا اخبار شروع کیا۔ ۱۹۱۹ء میں "حقیقت" لکھنؤ اور "پرتاپ" لاہور سے شائع ہوئے۔ اخبار "پرتاپ" آج تک اپنی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے نے "بندے ماترم" نکالا اور مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" شروع کیا۔

مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر، مصنف، انشا پرداز اور شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مجاہدانہ جذبہ اور حوصلے سے سرشار تھے اور تحریر و تقریر دونوں کے دھنی تھے۔

۱۹۲۳ء میں مہاشہ خوشحال چند نے "ملاپ" اور سوامی شردھانند نے "تیج" اخبار جاری کیا۔ ۱۹۲۳ء کو "ہمدرد" دوبارہ جاری ہوا۔ اس اخبار نے حصولِ آزادی کے لیے مجاہدانہ کردار اور بلند پایہ صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے لکھنؤ سے "سرفراز" اور جمعیت العلمائے ہند نے دہلی سے "الجمعیۃ" شروع کیے۔ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے "ویر بھارت" اور "پردیپ" پرتھم ضیا نے نکالا۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھنؤ سے "قومی آواز" جاری کیا۔

لالہ جگت نارائن نے جالندھر سے "ہند سماچار" جاری کیا جو اس وقت شمالی ہندوستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا روزنامہ ہے۔ سیّد سلیمان ندوی اور خواجہ حسن نظامی موجودہ دور کے ممتاز صحافی ہیں۔ آپ کے اخبارات اور رسائل نے اردو صحافت کو مالا مال کیا۔

کانگریس لیڈر پنڈت نہرو جی کی ایما پر کانگریس مخالف مہاشہ کرشن کے فرزند ویریندر نے ۱۹۳۶ء کے اوائل میں پنجاب کی راجدھانی لاہور سے روزنامہ "جے ہند" جاری کیا جس میں کانگریس کی تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ نیتا جی سبھاش چندر بوس کے جہادِ آزادی کے مشن کو نمایاں کیا گیا۔

دورِ جدید میں صحافت بڑی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ موجودہ جمہوری نظام نے جس معاشرے کی تشکیل کی ہے اس میں صحافت کو ایک مستحکم اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ ظالموں کے خلاف مظلوموں کی آواز ہے۔ یہ شخصی آزادی کی

اُردو صحافت

صحافت عربی زبان کے لفظ صحیفہ سے لیا گیا ہے جس کے لغوی معنی اخبار یا رسالہ کے ہیں۔ انگریزی میں اسے جرنلزم کہتے ہیں۔ اُردو میں یہ اخبار نویسی سے منسوب ہے۔ اس کے علاوہ جرنلزم کے معنی روزانہ رجسٹر، ڈائری یا اس کتاب کے بھی ہیں جس میں روزانہ کا حساب کتاب درج کیا جاتا ہے۔ ویبسٹرس تھرڈ انٹرنیشنل ڈکشنری میں صحافت یا جرنلزم کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"پیش کش نشر و اشاعت کے لیے رائج دل چسپ امور کے جمع
کرنے اور مدون کرنے کا نام صحافت ہے۔"

صحافت روز مرہ واقعات سے متعلق اطلاعات الفاظ، آوازوں اور تصاویر کے ذریعہ فراہم کرنے کو کہتے ہیں۔ صحافی سے مراد وہ شخص ہے جو خود کسی اخبار یا رسالہ کی ادارت کرتا ہو یا لکھتا ہو۔ اخبار کی اشاعت چھاپے خانوں میں موقوف ہے۔ اسی لیے جب ہندوستان میں مطبع قائم ہوا تو اخبار نکلا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے جذبات کو فروغ دینے میں ہندوستان کے اخباروں اور بالخصوص فارسی اور اُردو اخباروں نے بہت کام کیا۔ اُردو صحافت کے بانیوں میں ملک کے ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ ان صحافیوں کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ رہا۔

صحافت کا آغاز ایک ایسی غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ہوا جو صحافت کو اپنے اقتدار کا دشمن سمجھتی تھی۔ سنہ ۱۸۲۲ء ہی میں جب اُردو اور چند دیگر دیسی زبانوں کے اخباروں کا آغاز ہوا تو اسی سال اُردو اور فارسی زبانوں کے چھاپے کی صحافت شروع ہوئی۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل جان ایڈم نے لائسنس حاصل کیے بغیر اخبار جاری کرنے کی آزادی پر پابندی لگا دی۔ لیکن ہندوستان کے صحافیوں نے اس پابندی کا استقبال نہ کیا۔

ہندوستان میں ہمارے اولین صحافی راجہ رام موہن رائے نے اس پریس آرڈیننس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے دیگر اخباروں کے علاوہ اپریل ۱۸۲۲ء میں "مرآۃ الاخبار" کے نام سے فارسی میں ایک اخبار جاری کیا۔ ہندوستان ہی

میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں اخبار نکلنا شروع ہوئے لیکن اُردو زبان کا سب سے پہلا اخبار "اُردو اخبار" کے نام سے مولوی اکرم علی نے ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے نکالا۔ مولوی اکرم علی نے ہی اُردو رسم الخط کا پہلا چھاپہ خانہ ہندوستانی پریس کے نام سے کلکتہ میں ۱۸۱۰ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۱۰ء کے بعد ۱۸۲۲ء میں "اُردو اخبار"، "جام جہاں نما"، "مرآۃ الاخبار" سے تقریباً ایک ماہ قبل شروع ہوا۔ اس کا ایڈیٹر ہری ہردت ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک تھا۔ ان دنوں عدالتوں اور اشراف کی زبان فارسی تھی۔ بازار میں اُردو کا چلن نہ تھا۔ اس کے باوجود ہری ہردت نے عوامی زبان اُردو میں اخبار جاری رکھنے کا خیال نہ چھوڑا اور ایک سال بعد فارسی ایڈیشن کے ساتھ چار صفحات کا ایک آزاد اُردو ضمیمہ بھی شامل کیا جو قریب پانچ سال تک چھپتا رہا۔ ۱۸۳۶ء میں فارسی کے بجائے اُردو عدالتی زبان بنی۔ مشرقی ہند میں آغاز کے پندرہ سال بعد مطبوعہ اُردو صحافت ۱۸۳۶ء میں شمالی ہند میں آئی۔ یہاں دلی سے جاری ہونے والے اُردو کے اولین اخبار "دہلی اُردو اخبار" کا ایڈیٹر مولوی محمد باقر فطرتاً مجاہد آزادی تھا۔ یہ اخبار اپنے دور کے بے باک اخباروں میں پیش پیش تھا۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء تک چھپتا رہا۔ یہ اخبار متحدہ قومیت کی سوچ اور مقصدی وحدت کا حامل تھا۔

۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" دہلی سے چھپنا شروع ہوا جو ۱۸۴۹ء تک چھپتا رہا۔ ۱۸۴۰ء میں مدراس سے ایک اُردو اخبار "جامع الاخبار" شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۸۴۲ء سے "نور مشرقی" کی اشاعت دہلی سے شروع ہوئی۔ ۱۸۴۷ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج کے پروفیسر رام چندر نے "فوائد الناظرین" کے نام سے ایک اخبار نکالا اور ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار اسی سال میں پنڈت دھرم نارائن نے "قران السعدین" جاری کیا۔ پروفیسر رام چندر نے ایک ماہانہ رسالہ "محب وطن" کے نام سے بھی جاری کیا۔ ۱۸۴۶ء میں آگرہ سے ہفتہ وار "اسعد الاخبار" ۱۸۴۷ء میں مدراس سے "اعظم الاخبار"۔ یہ تمام اخبار ۱۸۵۷ء سے قبل کے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت بھی ختم ہو گئی اور اس کے اختیارات تاج برطانیہ کو منتقل ہو گئے۔ لیکن ہندوستانی صحافت کے متعدد طبقوں نے حکمرانوں کے لباس کی تبدیلی سے اپنے تصورات نہ بدلے۔ اس نئے دور کا آغاز بھی صحافت پر نئی سختیوں اور پابندیوں سے ہوا تھا جس کی وجہ سے کافی اخبار محتاط اور اعتدال پسند ہو گئے تھے لیکن یہ ایک وقتی مصلحت تھی۔ اُردو صحافت میں فرنگی راج کی ناانصافیوں اور ناگواریوں کے خلاف یہاں وہاں احتجاج ہوتا رہا۔ ۱۸۵۹ء میں مکند لال نے آگرہ سے ماہنامہ "تاریخ بغاوت ہند" جاری کیا جو

کھیل کود سے ایک اور بیش قیمت فائدہ پہنچتا ہے اور وہ ہے قواعد کی پابندی اور لیڈر کی فرمانبرداری۔ کھلاڑی کھیل کے قواعد و ضوابط پر پوری طرح عمل کرتا ہے۔ وہ ریفری کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی کا وہ ایک ایسا اصول سیکھتا ہے جو تہذیبی اور سماجی زندگی کی بنیاد ہے۔

ایک اچھا کھلاڑی ہمیشہ ایک اچھا شہری بنتا ہے۔ وہ سماج یا سرکار کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ قانون کو ہاتھ میں لینے سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو سکتا ہے۔ اگر بڑی تعداد میں لوگ قانون شکنی پر اتر آئیں تو ملک میں بدامنی اور لاقانونیت پھیل جائے گی اور قوم کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لیے قانون کا احترام اور رہنماؤں کی فرماں برداری اجتماعی یا قومی زندگی کے لیے اشد ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کھیلیں طلبا کے لیے بہت فائدے مند ہیں۔ اگر ان میں زیادہ حصہ لیا جائے تو نقصان دہ بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کھیلوں کی اہمیت بھی تعلیم کے بعد ہی ہے۔ زندگی میں تعلیم کے ساتھ کھیلوں کے متعلق ہر طالب علم کو دلچسپی ہونی چاہیے۔ اس لیے محکمہ تعلیم اور تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف کھیلوں کا بندوبست کریں۔ کھیل یا ورزش سے صحت، فرض شناسی، ضبطِ نفس، حوصلہ مندی اور دیگر اوصاف حاصل ہوتے ہیں۔

طالب علمی کی زندگی میں میں نے بہت سے کھیل کھیلے ہیں لیکن مجھے فٹ بال کا کھیل سب سے زیادہ پسند ہے۔ شروع میں میں نے کرکٹ کھیلنا شروع کیا لیکن اس کھیل میں مسلسل حرکت نہیں ہے۔ یہ کھیل مجھے اس لیے بھی پسند نہیں ہے کیوں کہ اس میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کھیل طالب علموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک قیمتی کھیل ہے۔ اس کا سامان بہت ہی مہنگا ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں اس کھیل کا کھیلنا ممکن نہیں۔ بچپن میں میں نے دیہاتی اور علاقائی کھیلوں سے بھی دلچسپی لی۔ وہاں پر کبڈی، گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا۔ کبڈی ایک دلچسپ کھیل ہے۔ اس میں کھیلنے والے ہر کھلاڑی کو نہ صرف ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے بلکہ اس کو اپنے بچاؤ کے لیے طریقے بھی خود ہی ایجاد کرنے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کھیل پرانے زمانے میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس کھیل میں کوئی خرچ نہیں ہوتا۔ یہ بڑا سستا کھیل ہے۔ لیکن یہ کھیل شہروں میں بہت کم کھیلا جاتا ہے۔ میں شہر میں رہتا ہوں اس لیے مجھے فٹ بال کھیلنے میں بہت مزا آتا ہے۔ جب سب کھلاڑی متحد ہو کر ایک ہی مقصد

کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ایک قاعدہ کی پابند ہوتی ہے۔ اس طرح کھیلنے والوں میں یک جہتی اور قاعدہ کی پابندی کی عادت ہوتی ہے۔ فٹ بال میں مستعد رہنے، تیزی سے حملہ کر کے اس پر عمل کرنے اور مواقع سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ آتا ہے۔ ریفری کی سیٹی کی آواز پر ایک دم رک جانے کی عادت سے نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ فٹ بال کے کھیل کے اوپر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں حادثات بہت ہوتے ہیں۔ لیکن کرکٹ میں بھی تو آنکھ پھوٹنے اور ٹانگ ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ فٹ بال کے کھیل میں بے ضابطہ کھیل کھیلنے، دوسرے کھلاڑی کو دھکیل کر یا گرا کر گیند چھین لینے کے متعلق نہایت سخت قانون بن گئے ہیں اور جب کھیل کے صحیح جذبے کے ساتھ فٹ بال کھیلی جائے تو حادثات کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

کھیلوں کی اہمیت اور میرا پسندیدہ کھیل

بزرگوں نے خوب کہا ہے کہ ایک صحت مند دماغ کے لیے ایک صحت مند جسم کا ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اگر آدمی کی صحت نہ ہوگی، جسم بیماریوں کا گھر ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ آدمی بے چین ہوگا۔ اسے دماغی سکون حاصل نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ آرام سے کچھ سوچ بھی نہیں سکے گا۔ اسی وجہ سے ہر انسان کو اپنی جسمانی اور دماغی صحت برقرار رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی کثرت ضرور کرنی چاہیے۔ کثرت سے کھایا پیا خوب ہضم ہو جاتا ہے۔ جسم کے فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ خون رگ رگ میں گردش کرتا ہے۔ ورزش نہ کرنے سے انسان سست اور ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جسم کو چست درست رکھنے کے لیے کھیل یا ورزش ازبس ضروری ہے۔

زندگی کی جدوجہد میں وہ لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں جن کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ بعض طلبا ہر وقت کتاب کے کیڑے بنے رہتے ہیں اور کھیل کود کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ ان کی صحت کمزور ہو جاتی ہے اور بعض کی تو نظر بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ طلبا اگرچہ امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کر لیتے ہیں مگر بڑے ہو کر ترقی نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس جو طلبا و طالبات اپنی پڑھائی کے دوران کسرت کرتے ہیں یا کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ زندگی کی جدوجہد میں آسانی سے کود سکتے ہیں۔ کثرت کے مقابلہ میں کھیل کود زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ کھیل کود سے سارے جسم کی کثرت ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کھلاڑی کھیل کے دوران ضبطِ نفس، فراخدلی، برداشت، پابندی، دیانت داری، اتحاد باہمی، جفاکشی اور دیگر اخلاقِ حسنہ حاصل کرتا ہے۔ یہ اخلاق و اوصاف اسے آئندہ زندگی میں کامیاب بناتے ہیں۔ مصائب و آفات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں پیدا کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھتا ہے۔ اس میں ٹیم سپرٹ آ جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جماعتی بھلائی اور ترقی کے لیے وہ ذاتی ایثار اور قربانی سے کام لیتا ہے۔ وہ سماج کی بہبودی کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اپنے آپ کو قوم کا ایک فرد قرار دیتا ہے اور قوم کی طرف اپنے فرائض کا احساس رکھتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی ہستی قوم یا جماعت کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔

کھیل کود سے کھلاڑی نظم و ضبط میں رہنا سیکھتا ہے۔ کیوں کہ ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کھلاڑی ان

اصولوں پر چلتے ہیں۔ جہاں کسی نے اصول توڑا، ریفری نے اسی وقت سیٹی بجا کر اسے بتا دیا کہ فلاں ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو قوم ڈسپلن کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کی ترقی رُک جاتی ہے۔ زندگی کے شروع میں ہی اگر لڑکے اور لڑکیاں کھیل کود کے ذریعے ڈسپلن کے پابند ہونا سیکھ جائیں تو یہ عادت زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ انسان کھیل کود کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں نظم و ضبط کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسکولوں میں کھیل کود کے پیریڈ کا ہونا بہت ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ طلبا تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈسپلن بھی سیکھ سکیں اور اگر یہ کہا جائے کہ نظم و ضبط تعلیم کا ایک اہم جزو ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہت سے طالب علم تو کھیلوں کے بل بوتے پر اونچے مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

کھیل کے میدان میں فرض شناسی کا درس ملتا ہے۔ ہر کھلاڑی کا مقام معین ہوتا ہے اور وہ اپنے دائرہ عمل کے اندر رہتا ہے۔ دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ تعاون اور اتحاد عمل کی وقعت سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ٹیم کی فتح کا راز ٹیم سپرٹ ہے۔ یہی ٹیم سپرٹ اس کی عملی زندگی میں اس کے آڑے آتی ہے۔ وہ مقابل ٹیم کے ساتھ بھی فراخدلی اور دیانت داری کا سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ دھوکے سے جیتنا پسند نہیں کرتا۔ وہ انصاف و ایمان سے سروکار رکھتا ہے۔ ناجائز داؤ سے کام نہیں لیتا۔ دشمن یا مخالف کا وار دلیری اور سکونِ خاطر کے ساتھ سہتا ہے اور وہ کبھی بھی حواس باختہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہار کو بغیر تذبذب کے فراخدلی کے سے تسلیم کرتا ہے۔ ہارنے والی ٹیم جیتنے والی ٹیم کو مبارکباد دیتی ہے۔

زندگی میں اپنی ناکامی کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا اور اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے دوبارہ کوشش کرنا ایک بہت ہی اچھی اور قابلِ تعریف عادت ہے اور یہ عادت کھیل کود کے ذریعے آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

کھیل کود سے دل بہلاوا ہوتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں دل بہلاوے کے لیے بہت سے ذرائع موجود ہیں۔ مثلاً ٹی وی، ریڈیو، وی سی ڈی وغیرہ۔ لیکن ان سب سے اچھا ذریعہ کھیل کود میں حصہ لینا ہے۔ اس سے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور کثرت بھی ہو جاتی ہے۔ کھیل کود سے ذہنی سکون ملتا ہے۔ کثرت سے خون کی گردش تیز ہوتی ہے جس سے جسم کے ہر حصہ میں آکسیجن پہنچتی ہے۔ جس سے جسم سڈول، خوب صورت اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ اور چہرہ پر رونق آ جاتی ہے اور اداسی دور ہو جاتی ہے۔ انسان خوش مکھ ہو جاتا ہے۔ یہ عام دیکھا گیا ہے کہ کھلاڑی خوش مزاج اور حاضر جواب ہوتے ہیں۔

ہے۔ لیکن ایسی چابک دستی سے کہ فکر اور جذبے کے عناصر الگ الگ معلوم نہیں ہوتے بلکہ حقیقت کے اندر چھپی ہوئی سچ یا شیریں شاعرانہ سچائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کی افسانہ نگاری میں بہت سی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اُن میں موضوعاتی اور ہیئتی خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل پر ان کے تجربات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کئی کہانیاں روایتی پلاٹ کے بغیر بھی تخلیق کیں۔ جن افسانوں کو کرشن چندر نے پلاٹ کی قید سے آزاد رکھا وہ بھی ان کے کامیاب افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی ہر تخلیق میں اُن کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے۔ اُن کی نقطۂ نظر اور ترتیب کی غمازی کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بُرائیاں، مذہب پرستی اور اس کے پیچھے حیوانیت، سماج کے غریبوں پر ظلم، ناانصافی، خود غرضی کو کرشن چندر نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان موضوعات کو کرشن چندر نے رومان انگیز اور دل کش پیرایہ میں اور حسین ادبی آرائشوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے فسادات کے متعلق کثرت سے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ جن میں مجموعی طور پر "اَن داتا"، "بالکونی"، "مہالکشمی کا پل"، اور فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق اُن کا افسانوی مجموعہ "ہم وحشی ہیں" قابلِ ذکر ہے۔ اس مجموعے میں افسانے "ہم وحشی ہیں" اور "پشاور ایکسپریس" اہمیت کے حامل ہیں۔ اس مجموعے کے تمام افسانے فسادات سے متعلق ہیں۔ اس میں فن کی اہمیت اور معنویت کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا ہے۔ کرشن چندر نے یہ افسانے ایک بلند مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھے اور مختلف صورتوں میں مختلف طرح سے پڑھنے والوں کو مخاطب کر کے لکھے لیکن ایسی چابک دستی سے ایک پسندیدہ مقصد کی حمایت کی بدولت ان میں ایک ایسی کشش پیدا کی کہ ہر مذہب و ملت اور طبقے کے پڑھنے والے ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ فسادات سے متعلق دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے لکھے لیکن جو انصاف و غیر جانبداری و فنی مہارت کرشن چندر کے قلم نے دکھائی وہ شاذ و نادر ہی مل پائے گی۔ ان کے یہ افسانے ان کی اپنی اعلیٰ شخصیت، بلند کردار اور انسان دوستی کا اعلیٰ ثبوت ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت نفسیاتی تجزیہ ہے۔ وہ لوگوں کے دماغوں سے زیادہ ان کے دلوں کو ٹٹولتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سب انسان دشمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔

کرشن چندر کی طرزِ تحریر اردو افسانوی ادب میں ایک نئی اور بڑی لطیف انوکھی چیز ہے۔ اس میں کہیں اکتاہٹ نہیں۔ ہم آہنگی اور انقلابی حرکت ان کی تحریروں کی جان ہے۔ کرشن چندر کو زبان دانی پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان

کا سا ذخیرۂ الفاظ اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے پاس نہیں ہے۔ کرشن چندر کی تحریریں بیک وقت آزاد و سرشار اور ٹیگور کی یاد دلاتی ہیں۔ اُن کی تحریروں کی سب سے زیادہ خصوصیت اُن کا بھی یہ چھلکنے والا اور چھلکانے والا انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے معمولی سے معمولی واقعات کی آڑ میں سماج پر بھرپور وار کیے ہیں اور سماجی بُرائیوں کو طشت از بام کرنے میں مہارت دکھائی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مناظرِ فطرت کی آرائش کا خاص خیال رکھا ہے اور اس میں کمال دکھایا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر ہی حقیقی معنوں میں قلم کا دھنی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوی مجموعوں میں "کشمیر کی کہانیاں"، "ہم وحشی ہیں"، "حسن اور حیوان"، "اَن داتا"، "نغمے کی موت"، "یوکلپٹس کی ڈالی"، "زندگی کے موڑ پر"، "طلسمِ خیال"، "ٹوٹے ہوئے تارے"، "ایک گرجا ایک خندق" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر کرشن چندر نے افسانوی ادب کو بہت فروغ دیا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے جدید اردو افسانے کو ترقی کی راہ پر بہت آگے بڑھایا۔ کرشن چندر نے ادبی دنیا میں جو شہرت حاصل کی ہے وہ کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے۔

پریم چند کے بعد حقیقت نگاری کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے۔ اُن کے یہاں محبت کا ایک خاص تصور ملتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں خلوص ہے اور اُن کی محبت میں چاندنی کی مقدس ٹھنڈک موجود ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں سے نئی نسل پوری طرح متاثر ہے۔ وہ فرقہ اور جماعت کے قائل نہیں ہیں بلکہ انسانیت کے قائل ہیں۔ اُن کے افسانوں میں زندگی کی مکمل تصویر ملتی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوی ادب میں مندرجہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے میں ان کی افسانہ نگاری سے بہت متاثر ہوں۔

☆☆☆

بچپن کشمیر میں بسر ہوا ہے اور ان کو کشمیر کے ساتھ بڑا لگاؤ رہا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہر جگہ کشمیر کا رنگ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں ان کی بچپن کی ناقابل فراموش یادیں ابھرتی جوانی کی نفسیات محبت کے شدید جذبات زندگی کا ایک رخ پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف قدرت کی فیاضی کا ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا مشہور افسانہ ''کالو بھنگی'' قابل ذکر ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ انہوں نے موجودہ دور ہر کردار کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے فن کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے کسان، مزدور، بھنگی، نوکر چاکر اور سماج کے گرے ہوئے کردار، طوائف کی حیثیت، شخصیت اور اس کی پستی سے ہم کو روشناس کرایا۔ کرشن چندر کے کردار ظالم نہیں بلکہ مظلوم ہے۔ کرشن چندر نے عورت اور مرد کے اجسام کا ذکر اور ان کے جنسی تعلقات کا تجزیہ بھی اپنے افسانوں میں کیا ہے۔

کرشن چندر کے یہاں رومان ہے۔ ابتدا میں وہ اپنے پیش روؤں میں پریم چند کی حقیقت نگاری کی بجائے رومانی افسانہ نگاروں یعنی نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم اور مجنوں گورکھپوری سے زیادہ متاثر ہوئے۔ کرشن چندر نے رومانی افسانہ نگاروں کی طرح زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کیا ہے۔ حقیقتاً کرشن چندر نے روح اور جسم کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ اور ایک ایسے ضروری موضوع کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جو زندگی میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے نئے فنکاروں میں ان کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

مزاج میں مزاح کی چاشنی ہونے کے سبب ابتدا میں مزاحیہ مضامین لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ہی ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں ہو چکا تھا۔ ان کی صلاحیت، شوق اور لگن نے ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت دلائی جس کے نتیجے میں لکھنؤ اور دہلی میں رہ کر وہاں کے ماحول اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر فلم کمپنی میں ملازمت کر لی۔ فلم کمپنی میں آنے کے کچھ دنوں بعد کرشن چندر نے لاتعداد کہانیاں، افسانے، ناول، ڈرامے اور فلمی مکالمے لکھے۔ ان کے قلم کی نمایاں خوبی یہ رہی ہے کہ وہ ہندوستان کو نہیں بھولے۔ ان کے کردار زیادہ تر یہیں ہندوستانی افراد ہیں۔ انہوں نے جہاں پڑھے لکھے، اچھے گھرانے کے لوگ اپنے افسانوں کے کردار بنائے ہیں وہاں نچلے طبقے کے بھنگی، مزدور، کسان بھی ان کے افسانوں کے ہیرو ہیں۔ کرشن چندر نہ واعظ بنے نہ مولوی بلکہ اکبر کی طرح انہوں نے لطیف طنز کا وار کیا۔ ''گدھے کی واپسی''، ''ایک گدھے کی سرگزشت'' وغیرہ میں کس کی

سرگزشت، کس کی واپسی اور کس کا کردار ہے۔

کرشن چندر کی زبان میں جادو ہے۔ وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں بہت ہی خوب صورت زبان میں پیش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے سارے تاریک اور روشن پہلوؤں پر اپنی نگاہیں رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومان کے ساتھ ساتھ شعریت بھی غالب ہے۔

کرشن چندر ادب میں افادیت و مقصدیت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حسن کاری، نشاطِ حسن، احساسِ حسن اور تخلیقِ حسن فن کے لیے ضروری ہیں۔ یکسر خوب صورت فضا تیار کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی حسین و جمیل صورت سے بھی محبت کرتے ہیں اور بدصورت کو بھی سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سماج میں انقلاب چاہتے ہیں اور سرمایہ داری سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو ادیب عام انسانوں کے افلاس، دکھ درد، جھونپڑیوں کی بدبو اور غریبوں کی زندگی کی بدصورتی سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا وہ صحیح معنوں میں حسن سے محبت نہیں کر سکتا۔ غریبوں کے ساتھ ان کی محبت ہے اور اشتراکی اصولوں کا احترام کرتے ہیں۔

کرشن چندر کے بیشتر افسانے خصوصیت اور مقاصد اپنے میں سموئے ہوئے ہیں۔ جس کے سبب ان کی تصانیف کی عظمت و مقبولیت نے بقا حاصل کی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کا رنگ جیسے جیسے ان کی تخلیقات میں گہرا ہوتا جاتا ہے ویسے ہی ویسے وہ فطرت کے نظاروں کو انسانی بے بسی کے رنگ گہرے کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کرتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے بہترین کرداروں میں مولی، بھگت رام، کالو بھنگی، دتاتی، ایسری نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے کردار ہماری طرح چلتے پھرتے گوشت پوست کے اور خالص ہندوستانی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے افسانہ نگاری میں تنوع پیدا کیا ہے۔

موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ان کے کرداروں میں بھی تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے ہر طبقے، ہر فرقے، ہر مذہب، ہر خطے کے ادنیٰ و اعلیٰ کرداروں کو ان کی مخصوص و منفرد صفات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر سماج کے دبے کچلے طبقے کے کردار جو تمام عمر محرومیوں، ناکامیوں، بیماریوں اور ذلتوں کا سامنا کرتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانے فنی و معنوی دونوں خوبیاں رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکر کو جذبہ میں ڈھالا گیا

مضمون نگاری کی زبان سادہ اور صاف ہونی چاہیے تاکہ خیال میں اُلجھن پیدا نہ ہو۔ عام طور پر مضمون تین قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ بیانیہ مضمون　　۲۔ حکایتیہ مضمون　　۳۔ فکری مضمون

☆☆☆

میرا محبوب افسانہ نگار

اردو کے افسانوی ادب میں نئی پود کے بہت سے افسانہ نگار ہوئے ہیں جن میں منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ نئی پود کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر میرے محبوب افسانہ نگار ہیں۔ کیوں کہ کرشن چندر کے علاوہ کوئی ایسا افسانہ نگار نہیں جس نے تیزی سے بڑھتے ہوئے زمانے اور اس سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتے ہوئے فن کو ہر آن سے اپنے قبضے میں رکھا ہو۔

کرشن چندر کے ابتدائی افسانے زمانے کے تقاضے کے لحاظ سے اپنے میں رومانیت، شعریت اور رنگینی سموئے ہوئے ہیں۔ کرشن چندر اُردو دنیا میں ایک افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے مقبول و معروف ہوئے۔ اُن کی ہر کہانی میں اتنی جان ہوتی ہے کہ کسی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ فطرتاً افسانہ نگار ہیں۔ اُن کو اپنے فن پر کامل قدرت حاصل ہے۔ اُن کے یہاں فن اور زندگی کا حسین امتزاج ہے۔

کرشن چندر کی حیثیت اُردو افسانہ نگاری میں اہمیت و عظمت کی حامل ہے۔ جس کے قلم سے نکلے الفاظ صفحۂ قرطاس پر پہنچ کر ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سماج کے گھناؤنے پہلو کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد اُردو ادب ایک نئی تحریک سے روشناس ہوئی جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کا مقصد ادب کے ذریعہ سماج کی خدمت، طبقاتی کشمکش کو ختم کرنا اور حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ جن افسانہ نگاروں نے اس تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا ان میں پہلا نام کرشن چندر کا ہے۔

کرشن چندر پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اُردو ادب کو اس تحریک میں شہرت دی۔ کرشن چندر ہمارے زمانہ کے سب سے ہر دل عزیز افسانہ نگار ہیں۔ کرشن چندر کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ وہی کشمیر جس کے پنڈتوں نے "اردو" کے گیسو سنوارے ہیں اور وہی پنجاب جہاں کہ اقبالؔ نے جنم لیا۔ اسی جگہ اس فن کار کی پیدائش ہوئی۔ انھوں نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز کشمیر سے کیا تھا۔ انہوں نے کشمیر سے متعلق بہت ساری کہانیاں لکھی ہیں۔ چوں کہ اُن کا سارا

یعنی مختلف انداز سے اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی سادہ طریقے سے پیش کرتا ہے کبھی انداز تحریر میں رعنائی اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے اسلوب کو مختلف صنعتوں سے سجاتا ہے اور قافیے اور وزن کا اس حد تک خیال کرتا ہے کہ نثر شعر معلوم ہونے لگتی ہے۔ میر امّنؔ نے سادہ نثر میں جادو جگانے اور سرورؔ نے مقفّیٰ اور مسجع نثر لکھی اور ان سے بہت پہلے وجہی نے سب رس میں نثر اور نظم گھلا ملا کر ایک دلکش نثر استعمال کی۔ غالبؔ نے سادہ نثر میں بے تکلفانہ انداز پیدا کیا۔ سرسید نے آسان نثر میں مشکل سے مشکل بات کہنے کی کوشش کی۔ حالیؔ کی نثر سادہ اور دل چسپ تھی۔ شبلی نے رومانیت کی چاشنی ملائی۔ محمد حسین آزادؔ نے نثر میں رنگینی کے قوس قزح کھلائے۔ ابوالکلام آزادؔ نے الہامی نثر کا انداز اختیار کیا۔ کسی نے محاوروں میں کام لیا، کسی نے تشبیہ و استعارے میں بات کی اور اس طرح اپنی نثر کو دل کش بنانے کی کوشش کی۔ ان ساری کوششوں کا مقصد صرف اتنا تھا کہ انداز بیان کی دل کشی کے ذریعے موضوع کو پڑھنے والے کے دلوں میں اتار دیا جائے۔ اس لیے مضمون نگاری کا اصل مقصد یہی ٹھہرتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کہ انداز بیان کی دل کشی ضروری ہے لیکن انداز بیان کی دل کشی خوب صورت نثر کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اور یہ خاصی مشقت اور محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ ابتدائی طور پر بھی مضمون نگاری کے لیے کچھ شرائط ہوتی ہیں۔ جن کی پابندی ضروری ہے:

۱ پہلی شرط یہ ہے کہ موضوع کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تاکہ اس کے لکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔
۲ دوسری یہ ہے کہ مضمون کا ہر حصہ اور پیراگراف ایک دوسرے سے مربوط ہو۔
۳ مضمون کا پہلا حصہ یا پیراگراف تمہید کا ہونا چاہیے۔ مگر تمہید ایسی ہونی چاہیے جیسے قصیدے میں تشبیب کا حصہ ہوتا ہے جو آخر میں موضوع سے مربوط ہو جاتا ہے۔
۴ دوسرا حصہ اصل موضوع کا ہونا چاہیے۔ موضوع ہر وقت ذہن میں رہنا چاہیے۔ ادھر ادھر کی باتوں سے بچنا چاہیے۔
۵ ہر بات کے لیے دلیل یا مثال ہونی چاہیے۔ بغیر دلیل اور ثبوت کے کوئی بات قابل قبول نہیں ہو سکتی۔
۶ اپنی بات آسان اور سیدھی سادی زبان میں پیش کرنی چاہیے۔
۷ جملے واضح اور چھوٹے ہوں تاکہ غلطی کا امکان کم ہو۔

۸ پیچیدہ اور گنجلک جملے بات کو الجھا دیتے ہیں جس سے مضمون الجھ جاتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔
۹ جملے ایسے ہوں جو آسانی سے لکھے جا سکتے ہوں۔ زبان پر قدرت کے بغیر جملوں کو زیادہ سنوارنے اور بنانے کی کوشش مضمون کو خراب کر سکتی ہے۔
۱۰ جملوں کی ترتیب قواعدی اعتبار سے ہو۔ یعنی فطری ہو۔ لفظوں کا انتخاب صحیح ہو ورنہ جملے غیر فطری ہو جائیں گے۔
۱۱ مضمون کا آخری حصہ یا پیراگراف اختتامی کہلاتا ہے۔ اس میں سمیٹتے ہوئے اختتامی جملے لکھنے چاہئیں یعنی اس طرح لکھنا چاہیے کہ موضوع کے ختم کرنے کا احساس ہو۔
۱۲ کسی بھی مضمون میں تکرار اور Repetition سے بچنا چاہیے۔ تکرار سے مضمون میں جھول پیدا ہو جاتا ہے۔
۱۳ املا صحیح ہونا چاہیے۔ رموز اوقاف یعنی Punctuations کا خیال رکھنا چاہیے۔

ابتدائی طور پر ان شرائط کا خیال ضروری ہے۔ ان کے بغیر مضمون میں جان نہیں پیدا ہوتی۔ باقی نثر میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے اور اپنا الگ انداز تحریر ایجاد کرنے کے لیے علم، مطالعے، زبان پر قدرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر کہ خدا نے یہ صلاحیت بخشی ہے یا نہیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یعنی یہ خوبی بازو کے زور سے پیدا نہیں ہوتی، جب تک کہ بخشنے والا خدا نہ بخشے۔

مضمون نگاری کیا ہے؟

مضمون ایک بیانیہ تفصیل ہے جس میں تسلسل اور ربط کا خیال رکھا گیا ہو۔ مضمون نگاری دراصل تحریر اور خیالات و افکار کی ترتیب کا نام ہے۔ مضمون کے پہلے حصے کو تمہید کا حاصل مضمون، خیالات و افکار کی ترتیب کا سینٹر یا درمیانی حصہ کہتے ہیں اور آخری حصہ کو جس میں خلاصہ یا نتیجہ پیش کیا جاتا ہے مضمون کا اختتام کہلاتا ہے۔

اس طرح یہ حالات کا شکار ہوئی۔ جلی زبان وادب اردو بھی اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی سے کام لیتے تھے۔ ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ عبرت کے مناظر اور کشت وخون کی ہولناکیاں عارضی طور پر بے شک ذہن و روح کو متاثر کر دیتی ہیں لیکن اس کے اثر سے فکر اہل کے احباب کا ذوق قوی تر ہو جاتا ہے۔ اور انسانی فطرت کا بنیادی جوہر اور زیادہ تابناکیوں کے ساتھ ہویدا ہوتا ہے۔ یہی اردو زبان وادب کے ساتھ بھی ہوا۔ باوجود مشکلات اور رکاوٹوں کے ساتھ اس زبان کی ترقی اور مقبولیت جاری ہے۔

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ان فتنوں سے بھرے ہوئے زمانے میں یقین کی شمع کو روشن رکھا ہے اور اپنی حد بساط تک زبان وادب کی خدمت میں برابر مصروف رہے ہیں۔ شاعروں کی زمزمہ نگاروں کی نثر آوری اور ادیبوں کی گل آرائیاں آج بھی رنگ وکیف کے ساتھ نکھار پر ہیں۔ ادب کے پرانے ذخیروں کو فراہم کرنے کا شغف بڑھ رہا ہے۔ اردو زبان وادب کی ترقی کا کام انفرادی اور اجتماعی سطح پر رہا ہے۔ انجمن ترقی کا گڑھ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، اردو جامعہ اردو علی گڑھ نے اردو زبان وادب کی جو زبردست خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کے صفحات سے کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ جدید اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں علی گڑھ تحریک نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے بھی اس کے فروغ میں بڑا کام کیا ہے۔ مذکورہ بالا نے اردو کی پوزیشن عوامی زندگی میں مستحکم کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی سرکاروں نے اردو کی ترقی کے لیے بعض قدم اٹھائے ہیں۔ مرکزی سرکار نے دوردرشن کے اردو پروگرام کے وقت میں اضافہ کیا ہے۔ ترجمے اور تصانیف کا اچھا کام کرایا ہے۔ بہار کی سرکار نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ اردو بورڈ بھی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی خصوصی دلچسپی سے توجہ دے رہی ہیں۔ دور حاضر کے شعراء، ادیب، تنقید نگار، ناول نویس، افسانہ نگار اور بہی خواہان اردو، اردو زبان کی ترقی و توسیع کے لیے برابر کوشاں ہیں۔ روزانہ، ہفتہ وار اور ماہوار اخبارات ورسائل میں اضافہ اس جائزے سے صاف عیاں ہے کہ اردو زبان وادب کا مستقبل روشن ہے۔ اس کی راہ میں حائل کانٹے، دقتیں اور پریشانیاں قدرے دور ہو رہی ہیں۔ اس کی مقبولیت ہمہ گیر واشاعت بڑھ رہی ہے، جو ترقی و توسیع کی ضامن ہے۔

اکائی: ۲۴

فن مضمون نگاری

مضمون نگاری بھی ایک فن ہے۔ بعض یہ فن کسب یعنی کوشش سے حاصل کرتے ہیں اور بعض میں یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔ وہ مضمون نگاری کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں اور اپنے مضمون میں ایسا حسن بھی پیدا کر دیتے ہیں جس کو پڑھ کر پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے اور اس کے مضمون کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو غالبؔ نے تقریر کے سلسلے میں بتائی ہے۔ یعنی:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن کوشش سے لکھنے والے بہرحال مضمون کے تقاضوں کو پورا کر دیتے ہیں مگر دلوں میں اتارنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کا حال بھی شعر جیسا ہے فطری شاعر سادہ انداز میں ایسا پُر تاثیر کہہ دیتا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دوسرے شاعر اس کا جواب نہیں دے پاتے۔ میرؔ کا ایک شعر تھا کہ

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

بقول حالیؔ بڑے بڑے شاعروں اور اہل علم نے مل کر بھی اس کا جواب دینے کی کوشش کی مگر چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کی حد تک رہ گئے اور جواب نہ دے سکے۔

مضمون نگاری دراصل اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا سمجھے کہ اس کے دل کی بات کہی جا رہی ہے اور آسانی سے وہ سب باتیں اس کے دل میں اترتی جائیں۔ اس کے لیے نثر نگار بہت سے اسالیب

ہوئے تھیں۔ کلچرل اکیڈیمی اردو فن پارے تخلیق کروا کر انھیں شائع کروانے کے لیے انھیں امداد دیتی ہے۔ اب اس خطے میں ۱۵ کے قریب انجمنیں قائم ہیں۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب"، محکمہ نشر و اطلاعات کے "تعمیر" اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو زبان کی توسیع میں جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ جات، کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ، دوردرشن اور ریڈیو کشمیر جموں کے کلچرل اینڈ لنگویجز کا نام سرِفہرست ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تحقیق و تنقید کے میدان میں سالوں سے گراں قدر کام ہو رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں میں اردو زبان و ادب کو مزید فروغ دینے اور تحقیقی و تنقیدی کاموں کی روایت شروع کرنے کا سہرا شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی ۱۹۷۵ء کے سر ہے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام بھی بہت سے مقالے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ جموں یونیورسٹی میں اب تک تقریباً ۹۰ ریسرچ اسکالروں نے مختلف موضوعات پر ڈی لٹ، پی ایچ ڈی اور ایم۔فل میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے بعض فاضل اساتذہ نے اردو زبان کی ترقی کے لیے بہت خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر شام لال کالڑا، ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی، ڈاکٹر ظہور الدین اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر خورشید عمر اصدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اردو زبان کی توسیع و ترقی کے لیے جموں یونیورسٹی نے ایم اے پروفیشنل کورس شروع کیا ہے۔ یہ ایک آزاد، خودمختار، پیشہ ورانہ پوسٹ گریجویٹ شعبہ ہوگا جس میں اردو زبان کے ذریعے طلبا کو پیشہ ورانہ کورسز کرائے جائیں گے۔ یہ کورس جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر ظہور الدین کی مخلصانہ انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ریاست میں آج بھی سرکاری طور پر ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے لیکن اس کی زمینی حقیقت کچھ بھی ہو اگر ریاست کے عوام زبان اردو میں دلچسپی نہ رکھیں تو سرکاری و نیم سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں نے جو کچھ اردو کے فروغ کے لیے کیا وہ کامیاب نہ ہوتا۔

اردو زبان کا مستقبل

اردو زبان و ادب کے مستقبل کا سوال آسان نہیں بلکہ خاصا پیچیدہ سوال ہے۔ طرح طرح کی پریشانیاں اور ذہنی الجھنیں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ سوال لسانی اور تہذیبی حیثیت سے کم اور سیاسی نہج سے زیادہ قابلِ غور ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے مگر اس پر مصنوعی ذرائع سے موت طاری کرنے کی کوشش جاری ہے۔

اردو اور ہندی کا جھگڑا فورٹ ولیم کالج ہی سے شروع کر دیا گیا ہے۔ انگریزی سیاست نے اس جھگڑے میں مزید اضافہ کیا۔ اس طرح تقسیم ہند سے پہلے ہی اردو ہندی کا جھگڑا کافی زور پکڑ چکا تھا۔ جس میں انگریزوں نے اور انگریزی سیاست نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی۔ یہیں کی آب و ہوا نے اس کے بدن کو توانائی زندگی، چہرے کو نکھار اور ماتھے کو حسن کی جوت دی۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ یہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زبان ہے عوام و خواص سب اس کو بولتے ہیں۔ 1887ء کے بعد بالخصوص اس زبان میں سادگی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور بہت حد تک اس میں سادگی، تسلسل اور آسانی پیدا ہو چکی ہے۔ اردو کی آئینی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیری مسلم ہے مگر اس کے باوجود اردو کے سامنے حسبِ ذیل دقتیں اور مشکلات ہیں۔ آئینی حیثیت سے اردو تسلیم شدہ زبانوں میں ہے۔ لیکن اسکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم کا باقاعدہ بندوبست نہیں ہے۔ عدالتوں اور دفتروں سے قریب قریب اس کا اخراج ہو چکا ہے انگریزی بدیشی زبان ہے پھر بھی ملکی زندگی میں انگریزی کا خاص عمل ہے۔ تعصب اور ذاتی مفاد کی وجہ سے اکثر اردو کو دیانت، اجتماعیت سے خارج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل اردو زبان میں ہی چھپتے ہیں۔ مگر اردو زبان و ادب کے ہی خلاف منافرت پھیلاتے ہیں۔ اور اس کے جائز مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ تقسیم ہند نے اردو زبان و ادب کے دو علیحدہ گہوارے قائم کر دیے۔ جس سے اس کی ترقی کو بڑا دھکا لگا۔ اس کی اشاعت و توسیع میں رکاوٹیں آ گئیں۔

بعض اہلکاران حکومت اور متعلقہ حکام نے اردو زبان و ادب سے بڑی بے توجہی برتی اور اس کی حیثیت اور وسعت کو کم کرنے کے درپے رہے۔ مختلف سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں نے اپنے سیاسی اور ذاتی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اردو زبان کو نشانہ بنایا۔

ریاست میں اردو زبان کی توسیع اور ترقی کے لیے یہاں عوام خلوص دل سے سرگرم کار ہیں۔ جموں و کشمیر میں کئی انجمنیں قائم ہیں جن کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے جہاں اردو کے شعرا اور ادبا کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، وہاں اردو زبان کے چاہنے والوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ غیر سرکاری سطح پر اردو زبان کی توسیع اور ترقی کے اقدامات کے شانہ بشانہ کئی سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جموں و کشمیر اکیڈمی فار آرٹ اینڈ کلچر کا نام اس سلسلے میں سر فہرست ہے۔ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال دوسری زبانوں کے علاوہ اردو کی بہترین کتابوں کو گراں قدر نقد انعامات دیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اپنی تخلیقات کو خود شائع کرنے والے فن کاروں کو اکیڈمی کی طرف سے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔ جموں و کشمیر غالباً ہندوستان کا پہلا صوبہ ہے جہاں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو اتنی مراعات حاصل ہیں۔ کتب کی اشاعت کے علاوہ اکیڈمی کے زیر اہتمام سال میں دو تین مرتبہ عالی شان مشاعروں اور ادبی مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر خواہ ہند میں اردو کا مستقبل کچھ ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں یہ زبان ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گی اور اپنے دلدادگان سے داد تحسین پاتی رہے گی۔

☆☆☆

اردو زبان کی موجودہ صورت حال

آزادی کے لیے ہم نے جدوجہد کی تھی لیکن جب ملی تو وہ اپنے ساتھ بہت سی بدبختیاں اور مصائب بھی لائی۔ ملک کی تقسیم اور فسادات کی آگ نے اس علاقے کو سب سے زیادہ متاثر کیا جس کے نتیجے میں ادبی محفلوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بہت سے ادیب پاکستان چلے گئے۔ کچھ نے ملک کے دوسرے ادبی مراکز کی طرف ہجرت کی یا اردو زبان چھوڑ کر کسی اور زبان کے سائے میں پناہ لی۔ آزادی سے پہلے بہت سے اردو اخبار نکلتے تھے۔ آزادی کے بعد جو باقی اخبار بچے وہ بھی بدحالی کا شکار ہو گئے۔ تاہم ریڈیو کشمیر جموں جو ۱۹۴۸ء میں قیام عمل میں آیا۔ تقسیم کے بعد ہی ریڈیو اسٹیشن اردو حلقوں کے لیے ادبی اسکول اور ادبی مرکز بھی تھا۔ اس مرکز سے نظمیں، غزلیں، تنقیدی و تحقیقی مضامین، اردو ڈرامے نشر کرنے کے علاوہ ریڈیو مشاعرے کو منعقد کرنے کی روایت کو از سر نو زندہ کیا۔ موجودہ دور میں ریڈیو جموں کشمیر سے اردو میں ''فروغ سخن'' پروگرام نشر کیا جاتا ہے جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ریاستی سرکار کے شعبۂ نشر و اشاعت نے بھی ریاستی سرکار کی پالیسیوں کے فروغ کے لیے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح خطے کے کونے کونے میں ڈرامے اور دوسری تفریحی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ سرکاری پالیسیوں کو خاص و عام تک پہنچانے کے لیے کتابچے اور اشتہارات اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔

ریاست میں ریڈیو اسٹیشن اور شعبۂ نشر و اشاعت کے علاوہ دوسرے ادبی مراکز بھی قائم ہوئے جس کے نتیجے کے طور پر متعدد ادبی انجمنیں اس خطے کے دور دراز علاقوں میں قائم ہو گئیں۔ ان ادبی انجمنوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کو نہ صرف ممکن بنایا بلکہ اسے توسیع دینے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطے میں متعدد ادبی مراکز ابھر آئے جن میں کشتواڑ، بھدرواہ، ادھم پور، جموں، راجوری، پونچھ وغیرہ کے ادبی مراکز قابل ذکر ہیں۔ ان انجمنوں کی وجہ سے ریاست میں اردو کا ماحول پیدا ہو گیا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اب اردو زبان کی صورت حال یہ ہے کہ ریاست کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو گا جہاں اردو کی کوئی ادبی انجمن کام نہ کر رہی ہو۔ ۱۹۹۳ء میں جب ریاستی کلچرل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تو اس سے دوسری زبانوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو کو مزید استحکام ملا۔ اس ادارے کے قیام سے اردو میں مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد

اور ادیبوں کو نشر و اشاعت کا ایک ایسا وسیلہ ہاتھ آ گیا جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتے تھے۔ اس اخبار نے ادبی اسکول کا درجہ حاصل کر لیا اور مقامی ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا جن کی تخلیقات ریاست سے باہر تخلیق ہونے والے ادب سے کسی طرح بھی کم نہ تھیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی اردو کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے انہوں نے جہاں اردو کے انسپکٹر آف اسکولز تعینات کیے وہیں ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات واعزازات دینے کے سلسلے بھی شروع کیے۔

اخبار "رہبر" کے بعد ملک راج صراف نے رسالہ "رتن" ۱۹۳۳ء میں جاری کر کے اردو صحافت کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ "رہبر" اور "رتن" کے بعد ادبی صحافت کو فروغ دینے کا اہم ترین کام نرسنگھ داس نرگس کے ہفتہ وار اخبار "چاند" نے ۱۹۳۲ء اور ماہوار رسالے "پریم" ۱۹۳۳ء نے کیا۔ یہ ریاست کا دوسرا ادبی اسکول تھا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ۱۹۲۶ء "نیا کشمیر کا آئین" بنایا جس میں اردو کو ریاست کی دفتری زبان قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو کا اطلاق پوری ریاست پر ہونے لگا۔ دفتری و سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ اردو کو رابطے کی زبان ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ آزادی کے بعد جب جمہوریہ ہند کے آئین کا اطلاق عمل میں آیا تو اس میں بھی اردو کو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ سری نگر کا پہلا اخبار "وِتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۳۲ء اور اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۵ء میں "ہمدرد" نکالا۔

آزادی سے پہلے اردو زبان میں مختلف اصناف پر بڑے زور و شور سے کام ہو رہا تھا۔ مثلاً شاعری، ڈراما، افسانہ، ناول، تنقید و تحقیق غرض کہ ہر شعبے میں ریاست کے قلم کاروں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں اور ادبی دنیا میں اپنی دھاک جمائی۔ جن میں نشاط کشتواڑی، ٹھاکر پونچھی، محمد عمر نور الٰہی، پی۔ ڈی۔ شرما، غلام رسول کامگار، جگدیش کنول، نرسنگھ داس نرگس، کرشن سموان، عشرت کاشمیری، نگار احمد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا بحث اس صورت حال کی غماز ہے کہ ریاست میں آزادی سے پہلے اردو کی کیا حالت تھی اور عوامی حکومت کے دور میں نئے لسانی تناظر کے ابھرنے سے اس کی صورت حال پر کیا فرق پڑا۔

☆

جموں کشمیر میں اُردو زبان کی اہمیت

کشمیر میں اُردو زبان کی اہمیت کا اندازہ یوں تو صرف ایک ہی بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ملک میں یہ واحد صوبہ ہے جہاں کی سرکاری زبان اُردو ہی ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر زمانہ قدیم سے ایک ہی ادبی مرکز رہا ہے۔ جہاں پر عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو بھی ہر دلعزیز ہوتی گئی۔ اور پھر یہاں کے لوگوں نے اس زبان کو گلے لگا کر سنوارنا اور نکھارنا شروع کیا۔ یہی سبب ہے کہ کشمیر نے اُردو کے کئی عالم پیدا کیے ہیں۔ جن میں آنجہانی آغا حشر کاشمیری، ڈاکٹر محمد اقبالؔ اور کرشن چندر کے نام قابل ذکر ہیں۔

کشمیر میں مُسلم اکثریت کے باعث بھی اُردو کو زیادہ تقویت ملی۔ لیکن ساتھ یہ بھی ٹھوس حقیقت ہے کہ صرف مُسلم آبادی نے ہی نہیں بلکہ ہندو لوگوں نے بھی اس زبان کو اپنایا اور اسے فروغ دیا۔ اور آج بھی کشمیر کو اُردو کے سلسلے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آج بھی کشمیر سے اُردو زبان کے اتنے اخبار شائع ہوتے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے صوبے میں ہوتے ہوں۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ مغل شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی اُردو کو کشمیر میں اپنے پاؤں مضبوط کرنے کا ایک سنہری موقع ملا تھا۔ شہنشاہ چونکہ اُردو کے دلدادہ ہوا کرتے تھے اس لیے وہ اپنے مشاعرے اور جشنوں کی محفلیں گرم رکھتے اور کشمیر میں بھی اکثر شاہی باغات میں چاندنی راتوں کو مشاعرے اور محفلیں ہوا کرتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کو تقریباً ہر دورِ حکومت میں یہاں خاصی رعایت ملتی رہی۔ جس سے یہاں کے لوگوں کا رُجحان زیادہ اسی طرف ہوتا گیا۔ اور اب اس موجودہ دور میں یہ حالت ہے کہ کشمیر حقیقتاً اُردو کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اُردو کے سلسلے میں سب سے پہلی نگاہ کشمیر ہی کی طرف اٹھتی ہے۔

ہندو راجوں اور مہاراجوں کے دورِ حکومت میں بھی اُردو یہاں پر عدالتی زبان رہی جو کہ آج بھی ہے۔ زبان کوئی بھی کیوں نہ ہو اس کی بقا، اور فروغ میں تبھی یقین کیا جا سکتا ہے جب اس کے چاہنے والے اس سے پیار کرنے والے اسے ہر قیمت پر زندہ رکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن اُردو زبان کو کشمیر میں یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں اس کے چاہنے والے اسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔

رائج رہی۔ تاہم مہاراجہ رنبیر سنگھ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی ریاست میں دفتری زبان میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کیں۔ ان کے دور میں اُردو عوامی سطح پر کافی مقبول ہو چکی تھی۔

اُردو زبان ریاست جموں و کشمیر کے تینوں خطوں (جموں، کشمیر اور لداخ) میں رابطے کی زبان ہے۔ اس دوران میں اگر کوئی زبان عام طور پر لکھی، پڑھی اور بولی جاتی رہی تو وہ اُردو ہی تھی۔ ایسے تو ریاست میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں مثلاً ڈوگری، کشمیری، پہاڑی، گوجری وغیرہ لیکن اُردو تینوں خطوں میں بولی اور پڑھی جاتی ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُردو کے فروغ اور ترویج کے لیے مثبت قدم اُٹھائے۔ اُنھوں نے ریاست میں اشاعتی مراکز اور چھاپے خانے قائم کیے۔ اُنھوں نے پہلی بار ریاست میں بندوبست سے متعلق ایک محکمہ قائم کیا۔ اس محکمے کے لیے بیرونِ ریاست سے اُردو جاننے والے تجربہ کار ملازمین کا تقرر کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُردو زبان کی ترقی کے لیے اسکولوں میں اُردو کو بہ حیثیت مضمون بھی نافذ کر دیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنی عنانِ حکومت میں پہلی بار ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس کی ایک جانب ڈوگری میں اور دوسری جانب اُردو میں "ریاست جموں و کشمیر" رقم ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ریاستی انتظامیہ کی رپورٹ بھی اُردو میں تیار کرنے کی ہدایت کی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں صوبہ جموں میں ۱۸۶۷ء "بدیا بلاس" کے نام سے ایک پریس بھی قائم ہوا جس میں اُردو کی ابتدائی کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اُردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا منصب عطا نہیں ہوا تھا لیکن زبان مقبولِ عام ہوتی جا رہی تھی۔ "بدیا بلاس" دیوناگری اور اُردو دونوں حروف میں بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ اس عہد کے اہم ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال خستہ کا نام سرِفہرست ہے۔ پنڈت ہرگوپال خستہ کے کئی کارنامے ہیں۔ ان کی تصنیف "گلدستۂ کشمیر" اُردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ خستہ کی دوسری تصنیف رسالہ "گلزارِ فوائد" ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد ۱۸۸۵ء میں پرتاپ سنگھ نے جموں و کشمیر کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس عہد تک اُردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ کافی وسیع ہو گیا تھا اور اُردو زبان ذریعۂ رابطہ بن چکی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اقتدار سنبھالتے ہی ریاست میں کچھ نئی اصلاحات کیں۔ ریاستی انتظامیہ کے سلسلے میں ایک کونسل قائم کی گئی۔ اس کونسل کے ممبر وزیرِ مال بھاگ رام تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو ایک تجویز ارسال کی کہ صوبہ

جموں میں فارسی کی جگہ اُردو کو عدالتی زبان بنایا جائے۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے مدِنظر ۱۸۸۹ء میں اُردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔

ہرگوپال کول خستہ کے چھوٹے بھائی سالگ رام سالک اس عہد کے دوسرے بڑے اہم نثر نگار ہیں۔ سالک کا ادبی ذوق بھی خستہ کی طرح لاہور کی ادبی فضاؤں میں پروان چڑھا۔ وہ عرصۂ دراز تک "اودھ اخبار" لکھنؤ میں مضامین لکھتے رہے۔ اُنھوں نے خود بھی لاہور سے اپنے بھائی کے ساتھ "خیر خواہِ کشمیر" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ جب سالک کشمیر آئے تو اُنھوں نے موروثی منازل، دھرم اُپدیش اور سیاست اربعہ جیسی کتابیں مرتب کیں۔ اس کے علاوہ لغاتِ اُردو اور محاوراتِ اُردو کے نام سے بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔ سالک نے اُردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت کی۔ اُنھوں نے رنبیر دنڈ بدھی (قانون تعزیراتِ جموں و کشمیر) کی مبسوط شرح تحریر کی۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطۂ دیوانی، قانون رجسٹری اور دوسری دستاویزات کی شرح بھی لکھی ہے۔ ان کا خاص ادبی کارنامہ "گنجینۂ معطرت" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ "داستانِ جگت روپ" سالک کا ایک اور ادبی کارنامہ ہے جو منظرِ عام پر نہ آ سکا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ساتھ ریاست میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ بیرونِ ریاست کے کئی نامور ادیبوں اور شعرا کی ریاست میں موجودگی تھی۔ جن میں آثر لکھنوی اور خوشی محمد ناظر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس ادبی ماحول نے ۱۹۱۲ء میں اس علاقے کی دوسری ادبی انجمنوں کے قیام کو ممکن بنایا۔ ان مختلف بزموں کے اہتمام سے مشاعروں اور ادبی نشستوں کی روایت کا آغاز ہوا۔ ریاست کے مقامی شعرا اور ادبا کی تخلیقات ریاست سے باہر شائع ہونے والے اخباروں اور اُردو رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں ہری سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی تو مہاراجہ نے سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک مجلس قانون ساز یہ قائم کی تو اس کی پوری کارروائی اُردو میں ہی ہوئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے کئی اصلاحات کیں۔ اُنھوں نے نیا کانسٹی ٹیوشن ایکٹ جاری کیا۔ اس ایکٹ کے تحت اُردو کو اسمبلی کی زبان قرار دیا گیا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اُردو اخبار "رنبیر" جاری کیا تو اس سے مقامی شاعروں

مظلوموں کا ظلم سہنا اور نہ یہ کہ ہر شب کے بعد آخر کار صبح کے اُجالے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے اے وطن اگر ہم آج تجھ سے الگ ہیں تو کل ضرور ملیں گے۔ یہ تھوڑے دنوں کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر آج ظالم طاقتور ہیں تو کیا ہوا۔ آخر کو ان کی یہ جدائی ختم ہوتی ہے۔ بس یہ ہے کہ تجھ سے تعلق خاطر رکھتے ہیں وہ رات اور دن کی گردش کا علاج جانتے ہیں۔

نہایت خوب صورتی سے شاعر وطن سے اپنی محبت اور اپنی تڑپ کا اظہار کرتا ہے۔ حالات کی تلخی کو بیان کرتا ہے اور پھر خود اپنے دوسرے ساتھیوں کو تسلی بھی دیتا ہے کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ کبھی نہ کبھی ہم جیت سے ہمکنار ہوں گے۔ ظالموں کو وہ گالیاں دیتا ہے اور ان کے خلاف زہر اُگلتا ہے۔ نرم اور لطیف سے انداز میں اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ ظالمو ظلم کر لو۔ تمہارے یہ مظالم ایک دن خود ہی اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اس لیے ایک طرح سے اسے اطمینان ہے کہ آخر رات گزرے گی اور سحر آئے گی اور اس طرح اپنے وطن اور اہل وطن کو پیغام دیتا ہے کہ دوستو گھبراؤ نہیں رات بھر کی جدائی بڑی بات نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی تم سے آن ملیں گے اور ہمیں آزادی ملے گی۔

ایک خوب صورت پابند نظم جس میں آزاد نظم کا بھی مزا ہے۔ نرم، لطیف اور ہلکے پھلکے لفظوں اور تراکیب کے ساتھ شاعر وطن کی محبت آزادی اور ظلم سے نجات کی بات کہتا ہے۔ نظم فیضؔ کی شاعری کے آہنگ سے قطعی ہم آہنگ ہے۔ مقصدیت کے ساتھ ساتھ انداز نرم روی اور لطافت اس کے خاص جوہر ہیں۔ اس لیے یہ نظم فیضؔ کی اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ آزادی سے پہلے کے حالات اور انگریزوں کے مظالم کو ذہن میں رکھیں تو نظم آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

☆☆☆

اکائی: ۲۳

جموں و کشمیر میں اُردو زبان کا آغاز و ارتقا

تمہید: ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کی شروعات کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ہوئی۔ ڈوگرہ عہد سے قبل کشمیر میں افغانوں اور سکھوں کی عمل داری رہی اور اہل کشمیر برسوں غلام در غلام رہے۔ اس زمانے میں یہاں فارسی زبان کا چلن رہا۔ جموں و کشمیر کے عوام نے یہاں بھی اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کر کے اس زبان میں قابل قدر سرمایہ پیدا کیا۔ ویسے تو ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کا چلن اتنا ہی پُرانا ہے جتنی پُرانی اُردو زبان بذات خود۔ جموں و کشمیر کی مقامی زبانوں کے حوالے سے یہ ایک وقت متضاد کیفیت تھی اور ہے۔ آزادی اور تقسیم ملک کے وقت ہماری ریاست کے لسانی ڈھانچے میں کوئی مادری زبان نہ ہمہ گیر تھی اور نہ ذریعہ تعلیم بننے کی استعداد رکھتی تھی۔ کشمیری، ڈوگری، بودھی، پہاڑی، گوجری جو کہ الگ گروہوں کی زبانیں ۱۹۴۷ء میں موجود تھیں مگر اُن کی سیاسی، طبقاتی اور سماجی شناخت ساقط رہی۔ اس لیے نئے کشمیر کے آئین سازوں نے اُردو زبان کی ہمہ گیر اہمیت کو عوامی سطحوں پر نفوذ، علمی، سیاسی اور سماجی شعور کے حصول کا ذریعہ بنایا۔

۱۸۴۶ء کا سال ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال انگریز حکومت نے لاہور معاہدے کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو محض پانچ لاکھ روپے کے عوض میں گلاب سنگھ نامی شخص کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ یہی شخص بعد کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ صرف دس سال تک ہی حکومت کر سکے۔ ۱۸۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو رنبیر سنگھ جموں و کشمیر کے مہاراجہ بنے۔ انھوں نے ۲۷ سال حکومت کی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ بڑے روشن خیال قسم کے انسان تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد سے پہلے ریاست کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ صوبہ جموں میں فارسی زبان کا علم کم تھا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ اور پھر مہاراجہ رنبیر سنگھ دونوں کے دوران اقتدار میں دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی ہی

جدوجہد میں لگی ہے۔

نہ چمن آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے

قصر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

ہندی قوم کے دلوں میں جو جوش "ہوم رول" کے لیے پیدا ہوا ہے اسے کوئی نہیں دبا سکتا۔ اب انگریز حکومت ہندوستانیوں کو داخلی معاملات کا انتظام کرنے کی اجازت دینی ہوگی۔ نظم اس شعر کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے

نہ لیں گے بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس نظم میں بے شک چکبست نے اس وقت کی ایک سیاسی تحریک کو موضوع بنایا ہے۔ نظم دائمی قدر و قیمت اور تخلیقی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس سے لوگوں کے جوش اور ولولے کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ قوم کی آزادی کی جدوجہد کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ نظم میں قومی بیداری، غلام دلوں کی کیفیت، مناظر فطرت اور ہمارے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔

☆☆☆

نظم "نثار میں تیری گلیوں پہ" کا تنقیدی جائزہ

فیض احمد فیض ان ترقی پسند شاعروں میں سے تھے جنھوں نے دھیمی لے میں آزادی کا ساز چھیڑا۔ ان کی نظموں میں وہ تلخی اور وہ گھن گرج نہیں ملتی جو بیشتر ترقی پسند شاعروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے لب و رخسار اور حب وطن کے معاملات کو ساتھ ساتھ برتا ہے۔ ان نظموں میں حب وطن، آزادی کی تڑپ اور آزادی کی خاطر جان گنوا دینے کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ سیاسی ظلم و جبر کو ایک روایت سمجھتے ہیں اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے ظلم و جبر سہنے اور مقابلہ کرنے کو ایک ریت۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ظلم و جبر کی ناؤ ہمیشہ نہیں چلتی۔ ہر رات کی صبح ہوتی ہے اور آخرکار وطن کی آزادی کا سورج بھی طلوع ہو کر رہے گا۔ وہ محبوب کو سمجھاتے ہیں کہ اے محبوب تیرے فراق میں ہم دل اس لیے نہ اٹھیں کرتے کہ آخرکار یہ فرقت کے لمحات ختم ہوں گے اور خوشیاں ہمارے قدم چومیں گی۔ کچھ اس طرح کے جذبات کا اظہار اس نظم "نثار تیری گلیوں پہ" میں بھی ہوا ہے۔

نظم یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اے وطن میں تیری گلیوں پہ قربان لیکن یہاں رسم یہ چلی ہے کہ کوئی شخص یہاں سر اٹھا کے نہ چلے۔ اگر کوئی تیرا طواف بھی کرنا چاہے تو وہ حالت سے نظریں چرا کے اور بہت احتیاط سے چلے اس لیے کہ یہاں اب ایسا انتظام ہے کہ اینٹ پتھر تک قید کر دیے گئے ہیں مگر کتے آزاد پھر رہے ہیں۔ یہاں کتوں سے مراد حکومت کے پٹھو ہیں یعنی وہ لوگ جو حکومت کے خیر خواہ ہیں۔ اور اے وطن یہاں تو ظلم کو معمولی سا بہانہ بھی کافی ہے۔ جو چند اہل جنون تیرے نام لیوا ہیں ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ یہاں انصاف نایاب ہے۔ اس لیے کہ وہی ظالم ہی منصف بن بیٹھے ہیں۔ وہ بھلا انصاف کیسے دے سکتے ہیں اور ان حالات میں داد فریاد کس سے کی جا سکتی ہے۔ مگر اے وطن تیرے نام لیوا تیرے فراق میں اسی طرح دن گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تیرے دن بھی پھر گئے ہوں گے مگر وہ سب سراب لگتا ہے اور ہم تیرے نام لیوا اسی طرح صبح شام کرتے رہتے ہیں۔ پھر شاعر ایک قاعدۂ کلیہ بتاتا ہے کہ یہ تو ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور اسی طرح ظالموں کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قید و بند سے گزرتے ہیں۔ ظلم سہتے ہیں اور آخرکار کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس طرح نہ ظالموں کے مظالم نئے ہیں اور نہ

اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کچھ چونکا دینے والی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں۔ داغ داغ اُجالا، شب گزیدہ سحر، شب مست، موج کا ساحل، جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہیں، بے صبر خواب گاہیں، سبک سبک تمنا، دبی دبی تھکن۔ یہ سب ترکیبیں نظم کو خوب صورت اور متاثر کن بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اصل میں اس کی صحیح منزل وہ ہے جہاں دیدہ و دل دونوں غلامی سے نجات پا جائیں۔ جسم کی غلامی سے آزادی تو مل گئی ہے مگر ذہنی غلامی سے آزادی اب تک نہیں ملی۔ شاعر کے نزدیک اصل آزادی وہی ہے کہ لوگ ذہنی اور دماغی طور سے بھی دوسروں کی پیروی نہ کریں اور صحیح معنوں میں اپنی روایت، اپنی تہذیب اور اپنے آزاد نظریات کے مطابق زندگی گزاریں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اس نظم میں یہ بات بالکل واضح ہے اور شاعر صحیح کہتا ہے۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور اسی لیے وہ صبح آزادی کو داغ داغ اُجالا اور ادھوری آزادی کہتا ہے اور اس لحاظ سے یہ نہایت کامیاب نظم ہے اور نہایت خوب صورتی سے شاعر نے اپنے اس خیال کو پیش کیا ہے۔

مزید مطالعے کے لیے پڑھیے اردو ادب دہلی کا فیض احمد فیض نمبر، مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔
شمارہ نمبر ۳ اور ۴، 1985 ایڈیٹر: ڈاکٹر خلیق انجم

مشق کے لیے:

۱۔ فیض احمد فیض کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیجیے۔

۲۔ ترقی پسند شعرا کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟

۳۔ فیض کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

☆☆☆

نظم "آوازِ قوم" کا تنقیدی جائزہ

چکبست نے اپنی شاعری میں حبِ وطن اور تحریکِ آزادی کی جد و جہد کو زیادہ تر اپنا موضوع بنایا۔ 1947ء میں ملک آزاد ہوا لیکن اس آزادی کے لیے لوگوں نے بہت زیادہ جد و جہد کی۔ اس جد و جہد میں شعرا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں چکبست کی کوشش خاص اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کیا اور انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی نفرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

اس نظم کے پیچھے بھی اس وقت کے سیاسی حالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ 1914ء میں جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی مالی اور جانی قربانیاں پیش کیں۔ خود مہاتما گاندھی نے بھی اس جنگ میں کافی تعاون کیا۔ انگریزوں نے جو "ہوم رول" کا وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں کیا۔ چنانچہ 1915ء میں مسز بیسنٹ نے "ہوم رول" کی تحریک چلائی۔ لوگوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لوگوں کے جوش اور ولولے کو دیکھتے چکبست نے اس تحریک کی حمایت میں یہ نظم لکھی۔ لکھتے ہیں ہند کے لوگوں کے دلوں میں جو جوش اور ولولہ ہے اس نے "ہوم رول" کا شور بلند کیا اور یہ شور زمین سے عرش تک ہے۔ لوگوں کے دلوں میں حبِ وطن کا جذبہ جوش مار رہا ہے۔ اُن کی یہ آرزو ہے کہ اپنے وطن میں ہمارا اپنا ہی انتظام ہو۔ انگریزوں کی غلامی سے لوگ تنگ آ چکے تھے۔ وہ ایک آزاد اور خود مختار حکومت چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے "ہوم رول" کی آواز اٹھائی۔

غلامی کے باعث وطن میں جو اداسی کے آثار چھائے، چکبست نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سارا چمن فریادی ہے۔ پھول جا بجا ہیں تو بھی وہ ہنس نہیں سکتے۔ ساری فضا میں اداسی چھائی ہے۔ انگریزوں نے جو ظلم و تشدد کیا تھا چکبست نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں بے پناہ درد ہے لیکن وہ اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ ان کو جو زخم لگے ہیں اس کے لیے تڑپ بھی نہیں سکتے۔ انگریزوں نے بہت زیادہ ظلم کیے۔ لیکن لوگوں نے اپنی آزادی کی جد و جہد ختم نہیں کی۔ اور اب "ہوم رول" کی جو تحریک چلی ہے اس کے لیے بھی قوم سرگرمِ عمل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہمیں اپنی سلطنت بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ پوری قوم اس تحریک کو کامیاب بنانے کی

ہے۔ اشعار میں تسلسل اور روانی ہے۔ زبان و بیان اور فن کے لحاظ سے بھی یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ جس میں ایک پیغام ہے۔ کیوں کہ اقبال بنیادی طور پر ایک پیامی شاعر ہیں۔ اور انھوں نے ہر جگہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے تمثیل کے ذریعے پیغام دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھی نظم ہے۔

☆☆☆

نظم ''صبح آزادی'' کا تنقیدی جائزہ

آزادی کے بعد کی نظم ہے۔ فیض احمد فیض نے یہ بات کہی ہے کہ اگرچہ ہمیں آزادی مل گئی ہے مگر وہ سیاسی آزادی ہے اور یہ ایسی آزادی ہے کہ غلام چلے تو گئے ہیں مگر سماجی اور معاشی اعتبار سے ہم ابھی پرانے ہی نظام کے غلام ہیں۔ یہ مکمل آزادی نہیں ہے۔ اس لیے ابھی ہمارے دیدہ و دل کی نجات کی گھڑی نہیں آئی ہے۔ اس لیے اے دوستو ابھی اپنی جدوجہد جاری رکھو ''بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔''

شاعر نے صبح کی آزادی کو داغ داغ اُجالا کہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رات کی کاٹی ہوئی صبح ہے۔ یہ وہ صبح نہیں ہے جس کا ہمیں انتظار تھا اور نہ یہ وہ صبح ہے جس کی ہم نے آرزو کی تھی۔ اور نہ ہی یہ وہ صبح ہے جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی تھی۔ ہم نے جس صبح کی خواہش کی تھی اور جس کے لیے ہمیں ہزاروں مصیبتیں اٹھانا پڑیں، اپنی محبتوں کو قربان کیا، ہر طرح کے ظلم سہے، بدن پکارتے رہے، بہار کا دامن بہت قریب تھا مگر جس کو ہم جھٹک کر آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھتے رہے۔ لو اب سُنا ہے کہ اُجالا اور تاریکی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ ظالموں کا طور بھی بدل چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نگارِ صبح کدھر سے آئی اور کدھر گئی۔ سر راہ چراغوں کو ان کی خبر ہی نہیں اور نہ رات کی گرانی میں کمی آئی ہے۔ اس لیے یہ وہ صبح نہیں جس کا ہمیں انتظار تھا۔ اس لیے کہ اس سے عام لوگوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ چند ہاتھوں اور چہروں کے بدل جانے کو آزادی نہیں کہتے۔ اس لیے یہ ہماری وہ منزل نہیں ہے جس کے لیے ہم جدوجہد کر رہے تھے۔ اس لیے اے دوستو ابھی اپنی کوشش جاری رکھو۔

اس نظم پر بہت سے لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ یہ رومانی نظم ہے۔ ایک ترقی پسند شاعر کو جس طرح انقلابی انداز میں دوٹوک بات کہنی چاہیے تھی وہ اس میں نہیں کہی گئی ہے۔ اس طرح کی باتیں کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ ہم جو آزادی چاہتے تھے یہ وہ آزادی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ترقی پسندانہ تاویل بھی کی جاسکتی ہے۔ اصل میں فیض دوٹوک انداز میں شور مچا کر ایسی بات کہنے والے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی ساری شاعری اشارے کنایے کی شاعری ہے۔ علامتوں اور اشاروں کی زبان میں انھوں نے شاعری کی اور اس کی ایک اچھی مثال یہ نظم بھی ہے۔

نیا شوالہ سے مراد آپسی بھائی چارہ، اتحاد و اتفاق اور امن و آشتی کا ایک ایسا شوالہ تعمیر کرنا ہے جو تمام تیرتھوں سے بلند ہو۔ اس نظم میں انہوں نے ہندو، مسلمانوں کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی بھی تلقین کی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ڈاکٹر اقبال کی زیر بحث نظم ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں ڈاکٹر اقبال نے ہندو اور مسلمان کو وحدت میں تصور کیا ہے۔ یہ نظم مجاز مرسل کی بہترین مثال ہے۔ فن اعتبار سے ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایک مکمل تخلیق ہے۔ ان کی یہ تخلیق ہندو مسلم اتحاد پر اردو میں بہترین نمونہ ہے۔

☆☆☆

"ایک آرزو" کا تنقیدی جائزہ

نظم "ایک آرزو" میں اقبال نے دنیا کی محفلوں سے تنگ آنے کا ذکر کیا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہاں شور و غل ہے۔ فریب ہے دغا بازی ہے۔ انسانیت کا نام و نشان ہی نہیں ہے سکون نام کی یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ اور یہاں رہنے کا کوئی مزہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں پر بے تکی باتوں کا بول بالا ہے۔ اقبال نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مجھے تو خاموش اور پرسکون جگہ کی تلاش ہے۔ جو پہاڑ کے دامن میں ہو وہاں ایک چھوٹا سا گھر ہو اور میں بے فکر اور آزاد ہو کر وہاں رہوں۔ وہاں چڑیاں نغمہ نگاری ہوں، پھول کھلے ہوئے ہوں، سبزہ بچھا ہو تنہائی کا عالم ہو، بلبل میری واقف کار بن جائے۔ ندی کے دونوں طرف سرسبز درخت ہوں جہاں شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے سرخ اور سنہری رنگ دکھائی دیں۔ وہاں میرا بستر ہو اور ایک ٹوٹا ہوا دیا ہو۔ اگر مسافر چلتے ہوئے تھک جائیں تو میری کٹیا میں آکر ٹھہر جائیں۔ کوئی میری ہمنوا ہو۔ اور جب میں رونے پہ آؤں تو میرا رونا ہر درد مند کو رلا دے۔ جو غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ ان جگا دے۔ یہی میری میری خواہش ہے اور یہی میری آرزو ہے۔

اقبال ہماری زبان کے فلسفی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے قلمے سے ملت اسلامیہ کے درد کی دعا کی ہے۔ وہ مسلمانوں ذلت سے نکالنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی بربادی پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ بے عملی کا شکار ہیں۔ اس کا ازالہ کرنے کے لیے اقبال نے خودی، خودشناسی اور خودآگاہی کا فلسفہ پیش کیا۔ کیوں کہ خودی کی تکمیل سے ہی انسان مرد کامل بن جاتا ہے۔ اور اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم آرزو میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جب یہ دیکھا کہ وہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنے لیے تنہائی کا راستہ تلاش کیا۔ اقبال نے اپنی بات کو اس نظم میں زیادہ پر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں انہوں نے صنعت تلمیح سے کام لیا ہے۔ استعارے اور تشبیہ سے بھی کام لیا ہے۔ اقبال اس نظم کی زبان صاف رواں اور شگفتہ ہے۔ خیالات میں بلندی پائی جاتی

ہمت کا درس دیا۔

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ قیامِ انگلستان سے قبل اُن کے ہاں وطنیت کا رنگ پوری طرح حاوی تھا۔ اس دور میں اُنھوں نے قومی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ جن میں اُنھوں نے وطن دوستی کے جذبات کو اُبھارا ہے۔ یا قوم کو عمل کی دعوت دی ہے۔ مثلاً ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، وطنیت، خطاب بہ جوانانِ اسلام، تصویرِ درد اور ہلالِ عید وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال کو شاعری کے ذریعے جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ دُنیا کے ممتاز شاعروں اور مفکروں کی صفِ اول میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال کا اُردو، فارسی کلام مکمل شائع ہو چکا ہے۔ "بانگ درا" بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز اُن کی مشہور تصانیف ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری میں بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ بانگ درا اور بالِ جبریل کے متن میں نہ صرف اندازِ بیان کے لحاظ سے بڑا فرق ہے بلکہ تخیل اور تصور کے لحاظ سے بھی بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں نظموں کا اختصار، تمہید کی کمی اور خیال کی گہرائی ہمیں بغیر متوجہ کیے نہیں رہ سکتی۔ وہ اقبال جنھوں نے ہمیں بانگ درا کی رنگینیوں میں غرق کر دیا تھا، آہستہ آہستہ تلوار کی تیزی نشتر میں بھرنے لگے۔

ڈاکٹر اقبال نے قومی و ملی نظموں کے علاوہ فطری یا نیچرل نظمیں، ظریفانہ نظمیں، اخلاقی نظمیں، تاریخی نظمیں، فلسفیانہ نظمیں، دعائیہ نظمیں لکھیں۔ بعض نظموں میں اُنھوں نے ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماؤں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً گوتم، رامچندر، نانک اور رام تیرتھ اور بعض نظموں میں اُنھوں نے مشہور شعرا کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً داغ، حالی، انجم، غالب، عرفی اور شیکسپیر۔

یورپ جا کر اُن کے اندر انقلابِ عظیم پیدا ہو جاتا ہے وہ وطنیت کے محدود نظریے سے ہمیشہ کے لیے منحرف ہو کر اسلامی اخوت اور مساوات کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اپنی شاعری اس قوم کی عیاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اس کا عکس اُن کی نظموں میں ملتا ہے۔

بانگ درا کی نظموں میں ڈاکٹر اقبال نے تہذیبِ مغرب کے زہر کا تریاق مہیا کیا ہے اور مسلمانوں کو صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ تہذیبِ مغرب کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ مت ہو جانا۔ بانگ درا نے اقبال کو شاعری کی

غیر فانی بنا دیا ہے۔ اُن کی اس تصنیف سے محبت و نوعِ انسانی کا سبق ملتا ہے۔

نظم "نیا شوالہ" ڈاکٹر اقبال کی تصنیف "بانگ درا" اُن کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ بانگ درا ڈاکٹر اقبال کی سب سے مشہور تصنیف بلکہ اُن کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اقبال کی غزلوں اور نظموں کا یہ دلکش مجموعہ ۱۹۲۳ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں وہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جو برسوں پہلے ملک میں مشہور ہو چکی تھیں۔ اُن کی اس تصنیف میں وہ غزلیں و نظمیں ہیں جن سے وطن پرستی کا رنگ ٹپکتا ہے۔ بانگ درا کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں اُن پر وطن پروری کا جذبہ غالب تھا۔ چنانچہ "ہمالہ" "صدائے درد، تصویرِ درد، آفتاب، ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ وطن پروری پر تصویرِ درد سے بہتر کوئی دوسری نظم اُردو میں نہیں لکھی گئی۔

"نیا شوالہ" اقبال کی ایک بہترین چھوٹی سی نظم ہے۔ یہ اُس وقت کی نظم ہے جب ڈاکٹر اقبال وطن پروری پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یعنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہونے سے پہلے۔ اس نظم میں اُنھوں نے ہندوستانی قوم خصوصاً ہندو اور مسلم کو قومی یکجہتی، اتحاد و اتفاق اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔

"نیا شوالہ" میں ڈاکٹر اقبال نے برہمن سے مخاطب ہو کر تلقین کی ہے کہ بتوں کی بجائے وطن کی پرستش کر۔ یہ نظم اقبال نے وطن پرستی کے دور میں لکھی تھی۔ اُن کی نظم "نیا شوالہ" وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے۔ کیونکہ اس کا اندازِ بیان بہت موثر اور دلکش ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے۔

نظم "نیا شوالہ" میں ڈاکٹر اقبال نے ہندو و مسلمانوں کو نیا شوالہ کی معنویت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

چکبست کی نظم "پھول مالا" کی زبان صاف، سادہ و رواں اور آسان میں لطافت اور پاشنی ہے الفاظ تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال ہے۔ خیالات میں بلندی اور اشعار میں ربط و تسلسل ہے۔ اس نظم میں زور بیان ہے انداز بیان، مقصد، مشورہ اور صدا کے لحاظ سے اس نظم کا عنوان نہایت موزوں ہے۔ مضمون اور بیان کے لحاظ سے آواز پُر اثر ہے۔ زبان و بیان اور فنی اعتبار سے یہ ایک بلند پایہ نظم۔ چکبست کی یہ نظم سماجی اور اصلاحی نظم ہے۔ اس نظم میں ان کا خلوص نمایاں ہے۔ خیالات کی پاکیزگی سے اس نظم کا رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اس نظم میں تاثیر بھی ہے۔ جذبات کی فراوانی بھی دلکشی بھی تازگی بھی۔ اس نظم میں ایک مسلح کا انداز بھی ہے مصلح کے انقلاب آفرین خیالات کا اظہار بھی ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کا مطلب فیشن پرستی، بے حیائی اور بے حجابی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مغرب اندھا دھند تقلید کے سخت مخالف تھے اور مشرقی تہذیب کی اعلیٰ قدروں کے حامی تھے۔ ان ہی باتوں کی انہوں نے اس نظم میں عکاسی کی ہے۔

☆☆☆

"نیا شوالہ" کا فنی وتنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں انہوں نے اپنی قومی اور ملی نظموں کو پڑھا۔ اُن کی نظم نگاری کا آغاز 1899 سے ہوا جب ڈاکٹر اقبال نے اپنی نظم "نالۂ یتیم" انجمن اسلام کے جلسے میں پڑھی تو حاضرین پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور ملی شاعری کی حیثیت سے اقبال کی شہرت سارے برِ اعظم میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے کلام سے قومی تحریکوں میں جان ڈالی۔ اپنی قوم کو ماضی کی حیرت انگیز داستانیں سنائیں اور اُن کو درسِ عمل دیا۔

اقبال کی قومی شاعری کی ابتدا "انجمن حمایت اسلام" سے ہوتی ہے۔ جہاں دوستوں کے اصرار سے اُن کو مختلف نظموں کے پڑھنے کا موقع ملا۔ "نالۂ یتیم" کے علاوہ فریادِ امت، شکوہ، تصویرِ درد وغیرہ اسی انجمن کی یادگار ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے لوگوں کے دلوں میں بڑی جگہ پیدا کر لی۔ قوم نے اقبال کو اقبال نے قوم کو پہچان لیا۔ جس سے اقبال مستقبل کے ایک بڑے شاعر کے روپ میں سامنے آئے۔

اقبال کی شاعری کی اہم ترین خصوصیات اُن کی جدت پسندی اور اجتہاد ہے۔ اُن کے یہاں میر تقی میر کا سوز و گداز ہے۔ غالب کی جدت ہے اور ذوق کی روانی۔ اُن کے یہاں تغزل بھی ہے اور شوکتِ الفاظ بھی۔ اُن کی بندشیں نہایت دل نشین اور چست ہوتی ہیں۔ خیالات میں بلندی اور گہرائی ہے۔ اُن کی شاعری میں فلسفیانہ حقائق ہیں اور رموزِ تصوف کا سرمایہ بھی ہے۔ زورِ بیان اور فراوانی جذبات کا سرچشمہ ہے۔ معانی اور مطلب سے لبریز ترکیبیں اور شگفتہ استعارے اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے دنیا کے تمام ممتاز شعرا سے استفادہ کیا۔ وہ ایک زبردست مفکر اور فلسفی تھے۔ انہوں نے معرفتِ نفس اور خودی کو مادی اور روحانی ترقیات کی بنا قرار دیا۔ اقبال کے کلام میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ اُن کا کلام فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمان قوم میں ایک بیداری کی لہر پیدا کر دی۔ انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کے معیوب و نقائص کی پردہ دری کی۔ نوجوانوں کو حریت و استقلال، عزم و

نظم کو کلاسیکی قرار دے سکتے ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا کہ شاعروں کا کام دیوتاؤں کی حمد و ثنا لکھنا یا قوم کی عظیم شخصیات کے حالات کو پیش کرنا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اُن سے سبق حاصل کریں۔ اس قول کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ شری رام چندر جی نہ صرف قوم کی ایک عظیم شخصیت اور اوتار ہیں بلکہ اُن کی زندگی کے حالات آج تک ہمارے لیے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔

چکبست نے اس منظر کو پیش کر کے نہ صرف ماں کی محبت کی تصویر کشی کی ہے بلکہ ایک فرزند کی حیثیت سے شری رام چندر جی کی فرماں برداری کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ایک بیٹا ماں باپ کے حکم سے بارہ برس تک جنگلوں میں رہنے کے لیے چلا جاتا ہے۔ فرماں برداری کی اس سے بہتر مثال ہم اپنی نئی نسل کے سامنے اور کیا پیش کر سکتے ہیں۔

پانچ بندوں کی اس نظم کو چکبست نے حالی کی طرح مسدس میں لکھا ہے۔ الفاظ میں سادگی کے باوجود ایک وقار اور شان موجود ہیں۔ جذبات نگاری میں چکبست کو کسی حد تک کمال حاصل ہے اور اس کا ثبوت یہ نظم پڑھتے ہوئے قاری کو خود بخود مل جاتا ہے۔

☆☆☆

"پھول مالا" کا تنقیدی جائزہ

چکبست پُرگو اور صاف گو شاعر تھے۔ اُن کا کلام سادہ و رواں، دلکش اور پُر تاثیر ہے۔ اصلاحی، اخلاقی اور وطنی جذبات کی ترجمانی میں اُن کا کلام بے مثال ہے۔ اُن کی غزلیں اور نظمیں ایک خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اُن کی شاعری اُن کی خلوص اور صداقت کا مظہر ہے۔ چکبست کی شہرت نظم نگاری کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

چکبست کا دیوان "صبحِ وطن" اُن کی حب الوطنی، جذبہ خدمتِ خلق اور آرزوئے اصلاحِ معاشرت سے معمور ہے۔ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ قوم اور وطن کے احساس سے پُر ہے۔ عنوان کچھ بھی ہو مگر وطن کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور نکل آیا ہے۔ چکبست کی شاعری عظمتِ ہند کا ترانہ اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ انھیں ہندوستان کی حقیقی عظمت و بزرگی سے بے لوث محبت تھی۔ اُن کی نظمیں ان باتوں کی ترجمان ہیں۔

چکبست کی نظم "پھول مالا" اُن کی عمدہ سماجی اور اصلاحی نظموں میں سے ایک ہے۔ چکبست تعلیمِ نسواں کی ترویج اور اشاعت کے دل سے خواں تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کریں اور ترقی کریں۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ مغربی تہذیب کی رَو میں بہہ کر اپنی تہذیب اور روایت کو بھلا نہ دیں۔ نظم "پھول مالا" میں لڑکیوں نصیحت کی ہے کہ وہ تعلیم جاری رکھیں اور ترقی کریں۔ مگر مغرب کے رنگ میں نہ رنگ جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی تہذیبی روایات کا کتنا خیال تھا۔

چکبست کا مقصد یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کا دامن چھوڑے بغیر لڑکیوں کو مغربی تہذیب میں کوئی اچھی بات ملتی ہے تو وہ اُسے اختیار کر لیں۔ اس نظم میں چکبست نے قوم کی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کرنے کا مشورہ دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ وہ اس مشورے پر عمل کریں۔

چکبست نے اس نظم میں قوم کی لڑکیوں سے مطالبہ کیا وہ مردوں کے جھانسے میں نہ آئیں۔ بزرگوں اور کمزوروں کو نئے رسم و رواج کے لئے مجبور اور پریشان نہ کریں۔ چکبست نے لڑکیوں کی تعلیم و ترقی کی پُرزور الفاظ میں مخالفت کی ہے۔ چکبست کی اس نظم میں ایک مقصد ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک صدا ہے۔ ایک تڑپ اور ایک امنگ ہے۔

نظم "گنگا" کا تنقیدی جائزہ

سرورؔ جہاں آبادی شاعرانہ ذوقِ فطرت میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے تمام اقوال و افعال اور حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بڑے آزاد خیال اور رند مزاج تھے۔ تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھے۔ ان کے کلام میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اُن کے کلام میں قدیم اور جدید کی آمیزش ہے۔ وہ سچے قوم پرست تھے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت اور زندہ دلی بھری ہوئی تھی۔ اُن کی نظمیں بڑے پائے کی چیز ہیں۔ جس کی مثال گنگا بھی ہے۔

سرورؔ کا کلام مبالغہ سے پاک ہے۔ انھوں نے اس نظم میں اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار نہایت سلیقے سے کیا ہے۔ اس نظم میں جوشِ بیان ہے۔ سرورؔ اپنے وطن سے شدید محبت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے وطنی جذبے کا اظہار اس نظم میں دلوں انگیز لب و لہجے میں کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال مناسب ڈھنگ سے کیا ہے۔ گنگا سرورؔ جہاں آبادی کی بلند پایہ نظموں میں سے ایک ہے۔ جس سے سرورؔ کی حب الوطنی کا جذبہ بظاہر ہوتا ہے۔ حب الوطنی سے یہ نظم مالا مال ہے۔ اس نظم میں سرورؔ نے معمولی باتوں کو بڑے جوش سے بیان کیا ہے۔ اس نظم میں گنگا کے قدرتی مناظر کی بہترین انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ ترکیبوں کی مناسب استعمال سے نظم کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اندازِ بیان سیدھا سادہ مگر پُر اثر ہے۔ سرورؔ نے دریائے گنگا کے اوصاف نہایت عمدہ ڈھنگ سے پیش کرتے ہوئے گنگا کی برتری ثابت کی ہے۔ اور گنگا میں سما جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ نظم کے اشعار میں تسلسل، تخیل میں بلندی اور ربط میں ہمہ گیری ہے۔

سرورؔ نے گنگا کی صفائی، پاکیزگی، دلکشی، دل ربائی اور شان کو نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ گنگا کے کناروں پر پائی جانے والی حسین و جمیل وادیوں اور قدرتی مناظر کا ذکر نہایت عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ دریا کی لمبائی کا تذکرہ مناسب الفاظ میں کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظم قدرتی مناظر کی تصویر کشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

☆☆☆

نظم "رامائن کا ایک سین" کا تنقیدی جائزہ

چکبستؔ لکھنوی ہمارے اُن گنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں اُن کی شاعری حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے سیاسی اور قومی مسائل کو کامیاب اور موثر طریقے سے موضوعِ سخن بنایا ہے بلکہ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی اقدار اور روایات کو اپنے اشعار میں پھر سے تازہ کیا ہے اور ہمارے قومی اور مذہبی ہیروز سے ہمارا تعارف کروایا ہے۔ زیرِ تبصرہ نظم "رامائن کا ایک سین" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نظم میں چکبستؔ نے رام چندر جی کے بن جانے کے لیے ماں کوشلیا سے اجازت لینے کا منظر بیان کیا ہے۔ اپنے پیارے دلبر فرزند سے بن میں جانے کی اجازت لینے کے لیے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے آنسو پونچھے یہ سوچ کر کہ اگر ماں کے سامنے اداس صورت لے کر گئے تو اس بے چاری کو اور بھی زیادہ صدمہ ہوگا۔ لہٰذا خود کو قابو میں رکھ کر جب وہ ماں کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ بے چاری خستہ حال سکتے کے عالم میں دروازے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ سکتے کے مارے یوں لگتا تھا جیسے کوئی پتھر کی صورت رکھی ہو۔ رام چندر جی جب سامنے گئے تو ماں نے حسرت بھری نظر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ ایک آہ کے ہونٹ سے نکلی اور نہ نکلا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ ان کا بدن اور چہرہ اُن کی دلی کیفیت کی عکاسی کرنے لگا۔ آخر انھوں نے زبان کھولی۔ زبان کا کھولنا تھا کہ یوں لگا جیسے ہونٹ نہیں کھلے بلکہ ایک زخم کھل گیا ہو۔ وہ رو رو کر رام چندر جی سے کہنے لگیں خاموش کیوں ہو میں جانتی ہوں تم یہاں کس لیے آئے ہو۔ اگر سب کی یہی خواہش ہے کہ تم بن میں باس کرو تو تم اُن کی خوشی بے شک پوری کرو۔ لیکن میں تمھیں اپنے منہ سے کس طرح اجازت دوں۔ کس طرح لاڈ پیار سے تم کو پالا اور نظر کو کس طرح فقیر بنا کر جنگل میں بھیج دوں۔

چکبستؔ نے رام چندر جی کی ماں سے وداع لینے کے اس منظر کو نہایت موثر انداز سے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر ماں کوشلیا کے دل کی حالت کو نہایت ہی بے باک، سچی اور فطری انداز میں پیش کیا ہے۔

دو ایک بندوں میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے جنھیں لکھنے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔ "رامائن کا ایک سین" چکبستؔ کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں شاعر تخیل اور جذبے کی آمیزش سے چند موثر بند لکھتے ہیں۔

اگر افلاطون کے خیالات کی روشنی میں اس نظم کا تجزیہ کیا جائے تو موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے ہم اس

نظم "مادرِ وطن" کا تنقیدی جائزہ

نظم "مادرِ وطن" سرورؔ جہان آبادی کی تخلیق ہے۔ جس میں انھوں نے ہندوستان کے قدرتی مناظر کی تصویر کشی کی ہے اور وطن کی سرزمین کو جنت کے اونچے طبقہ سے تشبیہ دی ہے۔ سرورؔ شاعرانہ ذوق فطری طور پر لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے تمام افعال و اقوال اور حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بڑے آزاد خیال اور رند مزاج تھے۔ ان کے دل میں ہمہ گیرت کی بڑی تڑپ تھی۔ وہ جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ یہی حقائق ان کی اس نظم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سرورؔ سچے قوم و وطن پرست تھے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت اور زندہ دلی بھری ہوئی تھی۔ یہی خصوصیت ان کی اس نظم میں بھی ہے۔

سرورؔ کی نگاہ نہایت وسیع تھی۔ انھوں نے نہایت سلیقے سے جذبات کو خیالات سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ان کے اشعار محسوسات کا مرقع ہیں۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز جوشِ بیان ہے۔ اپنے وطن سے وہ شدید محبت کرتے تھے۔ انھوں نے حب الوطنی کے جذبات کا اظہار اپنی نظموں میں دلوں انگیز لب و لہجہ میں کیا ہے۔ جس کا ثبوت یہ نظم ہے۔ اس نظم میں سرورؔ نے خوب صورت تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ الفاظ کی نشست اور ترکیبوں کا استعمال سرورؔ نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ "مادرِ وطن" سرورؔ کی اہم نظموں میں سے ایک نظم ہے۔ جو حب الوطنی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم سے سرورؔ کے حب الوطنی کے جذبہ کی شہادت ملتی ہے۔ یہ نظم جذبہ حب الوطنی سے مالا مال ہے۔ چوں کہ سرورؔ کے جذبات میں بڑی شدت اور مزاج میں بڑی وارفتگی تھی۔ اس لیے سیدھی سادی اور معمولی باتوں کو بھی انھوں نے بڑے جوش سے بیان کیا ہے۔ ان کا جذبہ حب الوطنی ایک خاص قسم کی گرمی رکھتا ہے۔ اس نظم میں تشبیہات، ترکیبوں اور الفاظ کا برمحل استعمال ہے۔ ترکیبوں کی موزونیت سے نظم کا حسن دوبالا ہو گیا۔ انداز بیان سیدھا سادہ مگر پُر اثر ہے۔ اس نظم میں سرورؔ نے قدرتی مناظر کو فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔ نظم کے اشعار میں ربط و تسلسل ہے۔ تخیل میں بلندی اور ہمہ گیری ہے۔

سرورؔ نے اس نظم میں وطن کے قدرتی مناظر کی دلکشی، دلربائی اور شان کبریائی نہایت خوب صورت انداز میں

پیش کی ہے۔ جذبات حب الوطنی کی عکاسی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان و بیان، تخیل و موزونیت کے لحاظ سے یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ البتہ کہیں کہیں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس نظم میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ ہیں۔

☆☆☆

نظم "مستقبل" کا فنی و تنقیدی جائزہ

"مستقبل" اکبرالہ آبادی کی ایک اہم نظم ہے۔ اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب و تمدن، ہندوستان کی معاشرت اور طرزِ بود و باش وغیرہ سے بہت فکر مند اور ڈرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی تہذیب و تمدن مشرقی تہذیب پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ آج تک اُس کا اثر نمایاں ہے۔ ساری مشرقی تہذیب جو کہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی تھی اس مغربی تہذیب کے سیلاب کی نظر ہو گئی۔ مشرق پر مغرب کا پورا جادو ہو گیا تھا۔ مغربی رہن سہن، طور طریقے، رسم رواج، کھانا پینا سب ہندوستانیوں کی پسند بن چکے تھے۔

ہندوستان میں مسلمان خاص طور پر اس تہذیب سے اثر انداز ہوئے وہ ماضی کو بھول گئے۔ حال کا اُن کو ہوش نہ رہا۔ مستقبل کی فکر نہ رہی۔ اکبرالہ آبادی کی یہ نظم مستقبل کا اشاریہ ہے۔ اکبر نے اس بے پناہ بڑھتے ہوئے انگریزی طرزِ حیات اور رسم و رواج اور معاشرے میں اصلاح لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی مشرقی تہذیب کی قدروں کو بنائے رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی تحریروں، نظموں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو اپنانے اور لوگوں تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے فنکارانہ چابکدستی سے لوگوں کو خوب ہنسایا اور اتنا ہنسایا کہ آنسو نکل پڑے۔ اس گدگداہٹ کے ساتھ ہی طنز کا نشتر گھونپ دیا۔ اکبرالہ آبادی کے زمانے میں مغربی تہذیب سامراجی سازش کا ایک روپ بن کر سامنے آئی تھی۔ انھوں نے نقلی انگریزیت کا طرح طرح سے مذاق اُڑایا ہے۔

اکبرالہ آبادی کی نظم "مستقبل" میں اُن کے تجربات و مشاہدات کا مجموعہ ہے۔ اس نظم کے ذریعے انھوں نے ہندوستانیوں کو مشرقی تہذیب کو اپنائے رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اور انگریزوں کی بے جا پیروی کو دھتکارا ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دل دادہ ہیں۔ وہ ہندوستانی رسم و رواج، مشرقی تعلیم و تربیت، زبان کو بنائے رکھنے کے حامی ہیں۔ وہ خاتونوں میں پردہ داری کی روایت کے حق میں ہیں۔ یعنی ہندوستانیوں نے انگریز پرستی کی دھن میں اپنے قومی وراثت قومی اور ملی تمدن، مذہبی اور اخلاقی اقدار پر کاری ضربیں لگائیں۔

اکبرالہ آبادی نے اپنی اس نظم کے ذریعے جو مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے وہ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ مغربی تہذیب نے جو گل کھلائے ہیں اُس کا پورا اندازہ اکبرالہ آبادی کو تھا کیونکہ وہ حساس دل رکھتے تھے۔ آج ہر چیز کا معیار بدل چکا

ہے۔ ہماری زندگی کو بحران کا سامنا ہے۔ یعنی دنیا کی نظروں میں شرافت کا معیار پرکھنے کا انداز بھی بدل جائے گا۔ جو لوگ آج کل بزرگی اور عظمت والے ہیں اور بلند مرتبہ رکھتے ہیں اُن کو حقیر سمجھا جائے گا۔ مختصراً کہ ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی اکبرالہ آبادی کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے۔

اکبرالہ آبادی کی زبان نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ اُن کی یہ نظم مستقبل کا اشاریہ ہے۔

☆☆☆

"برکھا رُت" کا تنقیدی جائزہ

اس نظم میں حالی نے پہلے تو گرمی کی شدت کا بیان کیا ہے اور گرمی کی وجہ سے پانی کے سوکھ جانے کا، انسانوں اور جانوروں کی بے چینی کا اور پانی کی قلت کا ذکر کیا ہے۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے جانداروں کی پریشانی، بے چینی اور بے قراری کا نقشہ کھینچا ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ گرمی کی وجہ سے لوگ کھانا نہیں کھا سکتے تھے نہانے کے لیے پانی نہیں ملتا تھا۔ ہر طرف اور ہر آدمی کی زبان پر پیاس پیاس تھا۔ ایک عرصہ سے بارش نہیں ہوئی تھیں۔ فصلیں سوکھ چکی تھیں اور ہر طرف گرمی کا بول بالا تھا۔ لیکن ایک دن ایسا آیا کہ خدا کی رحمت جوش میں آئی اور بارش برسنے لگی۔ بارش اس قدر تیز ہوئی کہ ندیوں میں، جھیلوں میں، دریاؤں میں پانی بھر گیا۔ اور باغوں میں، کھیتوں میں اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دینے لگی۔ گویا گاؤں نے کھیتوں نے غسل صحت کر لیا ہے۔ بارش ہونے سے فصلیں ہری بھری ہو گئیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ نوجوان ٹولیوں میں خوشی کے گیت گا رہے تھے۔ آخر میں حالی نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ میں لاہور میں ہوں اور بیماری کی حالت میں ہوں جب کہ میرا وطن دلی ہے اور میرے دوست و احباب اور ان کی محفلیں دلی میں ہیں۔ جو اکثر یاد آتی ہیں اور پریشان کرتی ہیں۔

حالی کی اس نظم میں سادگی، روانی، تسلسل، یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری ہے، واقعہ نگاری ہے، جذبات نگاری ہے، صداقت نگاری ہے اور ربط ہے۔ اس نظم کے اشعار میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حالی نے اس نظم کے ذریعہ برسات کے نہ ہونے کے مصائب اور برسات ہونے کے فائدوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم تصویر کشی اور مرقع کشی کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔ الفاظ، محاورات اور تشبیہات کا برمحل استعمال ہے۔ یہ نظم پڑھ کر برسات کا ایک سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ یہ حالات و واقعات آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک عمدہ نظم ہے۔

☆☆☆

مدرسہ علی گڑھ کا تنقیدی جائزہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکبر نے طنز و ظرافت سے کر قوم کے نوجوانوں کو بالخصوص اور قوم بالعموم جھنجوڑا ہے۔ ان کے ظریفانہ کلام میں درد و کسک ہے اور نصیحت کی تلخی اور خوشگواری بھی ہے۔ اس کا ثبوت اکبر کی نظم مدرسہ علی گڑھ میں پایا جاتا ہے۔ جس کا تجزیہ حسب ذیل ہے۔

اس نظم میں اکبر نے مدرسہ علی گڑھ کے لیے، اس میں تعلیم پانے والے شریف زادوں، امیر زادوں اور رئیس زادوں کے لیے دعا بھی کی ہے اور قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کر کے جھنجوڑا بھی ہے۔ اس نظم میں طنز بھی ہے اور پند بھی ہے۔ اکبر چوں کہ بنیادی طور پر مغربی تعلیم اور تہذیب کے خلاف تھے اور سرسید کے نئے خیالات سے بھی متفق نہ تھے۔ لیکن وہ مدرسہ علی گڑھ کے حق میں ضرور تھے۔ البتہ انگریزی تعلیم کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ اس وجہ سے اکبر نے اس نظم میں مدرسہ علی گڑھ کے لیے دعا کی ہے کہ یہ مدرسہ کامیاب ہو اور خدا تمام امراض سے اس کو محفوظ رکھے۔ دوسری طرف زیر تعلیم طلبہ کی تعریف کی اور تیسری طرف مشرقی علوم اور تہذیب پر زور دیا ہے اور مغربی تعلیم اور تہذیب کی برائیاں گنوائی ہیں۔ چوتھی طرف قوم کے نوجوان کو دین کی ترقی کے لیے نصیحت کی ہے۔ اور بارگاہ خداوندی میں دعا کی ہے کہ وہ زیر تعلیم طلبہ کو دین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس نظم کی زبان نہایت صاف، سادہ، عام فہم، رواں اور روزمرہ ہے۔ محاورات اور تشبیہات کا برمحل استعمال کیا ہے۔ اشعار میں تسلسل اور ربط پایا جاتا ہے۔ اکثر جگہوں پر اکبر نے ظرافت اور طنز سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں نصیحت بھی کی ہے کہ یہ نظم مدرسہ علی گڑھ اس میں زیر تعلیم طلبہ، مشرقی تعلیم و تہذیب کی خوبیوں اور مغرب کی تہذیب کی برائیوں کی تصویر کشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کلام موزوں ہے جس میں ترنم بھی پایا جاتا ہے۔ خیالات میں بلندی ہے، تاثر ہے، دلچسپی ہے اور بے باکی ہے۔ نظم کو پڑھ کر ایک مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ ایک اچھی نظم ہے۔ اور زبان و بیان کے لحاظ سے نظم نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اکبر نے اپنے دلائل کو نہایت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

☆☆☆

''مسدس مدوجزر اسلام'' کا تنقیدی جائزہ

مسدس مدوجزر اسلام مولانا حالی کا وہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ان کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ یہ نظم محسن قوم سرسید احمد خان کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ حالی نے خود اس کے لیے سرسید کے مرہون منت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اس پر انھیں فخر بھی حاصل تھا۔ مسدس کے آغاز میں سات بند تمہید کے لکھ کر اس کے بعد عرب کی اس حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی۔ جس دور کا نام ''دورِ جاہلیت'' تھا۔ اس کے بعد اسلام کا طلوع ہونا اور رسول اکرم کی تعلیمات سے ریگستان کا سرسبز ہونا اور رسول کی امت کو دینِ اسلام کی دولت سے مالا مال کرنا اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال کا حال لکھا ہے۔ مسدس مسلمانوں کے کھوئے ہوئے جلال اور گذری ہوئی عظمت اور گذری ہوئی زندگی کی نا صرف خون چکاں تاریخ ہے بلکہ ان کے زوال کا مرثیہ ہے۔ حالی نے نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اسلام کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی خدمات جلیلہ پر جس طرح پانی پھیرا ہے حالی نے اس پر نہایت سختی سے طنز کیا ہے اور مسلمانوں کو اس کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں حالی نے نہایت عمدہ انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

مسدس کو حالی نے قوم کے لیے ایک ایسا آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں۔ اس نظم میں کچھ تاریخی واقعات ہیں، چند قرآنی آیات اور چند حدیثوں کا ترجمہ ہے۔ مسدس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگین بیانی ہے اور نہ مبالغہ ہے۔ اور نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جیسے مضمون میں بھی حالی نے دلکشی اور دلچسپی پیدا کی ہے۔ حالات اور واقعات کو ایک اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخ جیسے مضمون میں شعر و شاعری کی نزاکتیں اور زبان و بیان کی لطافتیں بیان کرنا صرف حالی کا ہی کام تھا۔ حالی نے پوری نظم میں کہیں بھی مبالغہ کا استعمال نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ صداقت اور ظرافت باری سے حالی نے اس نظم میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ مسدس میں کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جنھیں پڑھ کر قاری آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نظم کا خاتمہ ایسے واقعات پر کیا گیا ہے کہ جن میں بارگاہ خداوندی اور بارگاہ رسالت میں یہ دعا کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو پھر وہی مرتبہ

حاصل ہو جو پہلے تھا۔ حالی نے دامے درمے سخنے اور قدمے دین اسلام کی خدمت کی ہے۔ حالی نے ہمارے سامنے مسدس کے ذریعہ ایک نئے قومی شاعری کا باب اس میں پیش کیا ہے۔ مسدس کے ذریعہ حالی نے ایک نئی زبان پیدا کی ہے۔ مسدس کی زبان نہایت سادہ، صاف رواں اور شستہ ہے۔ گہرے اور معانی خیز مطالعے اور عبرت انگیز مضامین کو حالی نے روزمرہ میں ادا کیا ہے۔ مسدس کے ذریعہ اردو زبان و ادب میں حالی کو بلند درجہ حاصل ہے۔

☆☆☆

نظم "مفلسی" کا تنقیدی جائزہ

نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں مختلف زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے عام لوگوں کی زبان میں شعر کہے ہیں۔ ان کے کلام میں اثر ہے اور زندگی کے واقعات کی تصویر کشی ہے۔ "مفلسی" نظیر اکبر آبادی کی عمدہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں نظیر نے بتایا ہے کہ بدقسمتی سے انسان تنگ دست ہو جاتا ہے اور تنگ دستی سے اُسے ہر ایک پریشان کرتا ہے اور وہ مختلف مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مفلس آدمی کو سارا دن بھی بھوکا رہنا پڑتا ہے اور کبھی بھوکا سونا پڑتا ہے۔ مفلسی میں انسان خدا کا نام بھی بھول جاتا ہے۔ اُسے اپنی عزت کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ایک روٹی کے لیے وہ اپنی جان دے دیتا ہے۔ مفلس آدمی جہاں دسترخوان بچھا ہوا دیکھتا ہے اُس پر وہ ٹوٹ پڑتا ہے۔ جب مفلسی آتی ہے تو آدمی کو ہر چیز تیکھی اور کڑوی دکھائی پڑتی ہے۔ اُسے کوئی خوشی میسر نہیں ہوتی۔ مفلس آدمی کے دکھ درد کا کسی کو احساس نہیں ہوتا۔ اگر وہ عقل مندی کی بات بھی کہے تو کوئی اُسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مفلس آدمی کو لوگ گدھا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اُس کا منہ خشک ہوتا ہے۔ رنگت زرد اور بدن پر میل ہوتی ہے۔ مفلسی انسان کو آسمان سے زمین پر گرا دیتی ہے۔ جب مفلسی آتی ہے تو شرافت چلی جاتی ہے۔ مفلس آدمی کو لوگ نزدیک نہیں آنے دیتے۔ آخر میں اس نظم میں نظیر نے دعا کی ہے کہ خدا کسی کو مفلسی میں مبتلا نہ کرے۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم مفلسی ایک عمدہ نظم ہے جس میں انھوں نے فنی مہارت سے مفلسی کی عکاسی کی ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت صاف، سادہ، عام فہم اور رواں ہے۔ نظیر نے اس نظم میں لوگوں کی زبان استعمال کی ہے۔ مختلف چیزوں کے نام جو سماج میں بولے جاتے ہیں۔ نظیر نے انھیں ہی شعری جامہ پہنایا ہے۔ اور اس فنی مہارت سے الفاظ، محاورات، تشبیہات اور ضرب الامثال استعمال کیے ہیں کہ نظم معیاری بن جاتی ہے۔ یہ نظم تصویر کشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جس میں مفلس انسان کے حالات کو بیان کیا ہے۔ اس نظم میں تاثر ہے، دلچسپی ہے اور ترجمانی ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی بھی پائی جاتی ہے۔ معانی آفرینی ہے۔ شگفتہ، شیریں اور آسان زبان میں مفلس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ ایک عمدہ اور قابل قدر نظم ہے۔

☆☆☆

لیے محتاج بھی آدمی اور در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور بھی آدمی۔ یہی آدمی بھلائی، خیر، اور رحمت کا پیکر ہے اور یہی شر، زوال اور زحمت کا روپ بھی، فرشتہ بھی یہی ہے اور شیطان بھی یہی۔ جہاں آدمی ہی دکاندار ہیں اور آدمی ہی خریدار اور ریشمی کپڑے پہننے والا بھی آدمی ہے اور گودڑی میں دن گزارنے والا بھی آدمی۔ اشرف سے لے کر کمینے تک اس دنیا میں سب آدمی ہی آدمی ہیں۔ غرض یہاں شاعر نے آدمی کے مختلف پہلوؤں کا حقیقی نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو آدمی کو گراں گزر سکتی ہیں لیکن نظیر نے ان حقیقتوں کو ایسے موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ آدمی اپنی زوال کو مذاق مذاق میں مزے مزے لے کر پڑھتا ہے۔ ان کو اشعار کی تہ میں چھپے طنز کے نشتر کی ذرا بھی چبھن محسوس نہیں ہوتی۔

نظم کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نظم "آدمی نامہ" میں نظیر نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ انسان انسان سب برابر ہیں۔ رنگ و نسل، مذہب و ملت اور اعلیٰ و ادنیٰ کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان آپس میں فرق پیدا کرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر ہر شخص آدمی ہونے کے ناتے، مساوی حقوق کا مستحق ہے۔ انسانوں کے درمیان کسی امتیاز یا تفریق کو روا رکھنا مناسب نہیں۔ جو لوگ انسانی برادری کو مختلف طبقات اور مختلف مذاہب کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ نظیر نے انھیں بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم "آدمی نامہ" نظیر کی انسان دوستی اور عوام پرستی کا واضح ثبوت ہے۔ انسان کی عظمت کے سامنے وہ دولت اور اعلیٰ و ادنیٰ کے فرق کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

اس نظم میں نظیر نے مفلس عوام کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے۔ "آدمی نامہ" میں انھوں نے خاص بیانیہ انداز میں طرح طرح سے یہی سمجھانے کی سعی کی ہے کہ "اشرف اور کمینہ سے لے کر شاہ و وزیر" "ہر شخص" "آدمی" ہونے کی حیثیت سے ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی کشتی کا سوار ہے۔ نظیر نے دیکھا کہ بعض لوگ جاہل عوام کو طرح طرح سے اپنے مکر و فریب کے دام میں پھنسا رہے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد سیدھی سادی عوام کو بہکا کر ان سے روپیہ پیسہ اینٹھنا ہے۔ اس لیے انھوں نے ایسے لوگوں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ غریب عوام ان ریاکاروں کی سازشوں کا شکار نہ بن سکے۔ رمال اور نجومی آدمی آج بھی جاہل اور نا سمجھ لوگوں کو بہلا کر اور دوسرے طریقوں سے اپنے فریب میں پھنسا لیتے ہیں۔ نظیر کے زمانے میں یہ بات عام تھی۔ بے چارے عوام آسانی سے غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ نظیر نے ان جھوٹے خداؤں کا راز فاش کر دیا تاکہ عوام ان سے بچ سکیں۔

نظیر عوامی شاعر ہیں اس لیے وہ عوام سے دلچسپی رکھنے والے موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

انسانی وسائل سے انھیں گہری محبت اور دلچسپی ہے۔ اس لیے وہ معاشرے میں پائی جانے والی نابرابری، ذات پات اور اونچ نیچ پر وہ زبردست طنز بھی کرتے ہیں اور صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ وہ "آدمی نامہ" کے ذریعے بھی اپنے اس نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں اور آدمی کے درمیان پائے جانے والے ہر فرق کو ختم کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

"آدمی نامہ" کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ نظیر نے اس نظم میں عام بول چال کی زبان کو ملحوظ رکھا ہے۔ انداز بیان بھی عام فہم ہے اس نظم میں نظیر نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنے فنی جوہر دکھائے ہیں۔ نظم میں کہیں کہیں کھڑی بولی، برج بھاشا، عربی، فارسی اور پنجابی کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی نیچرل شاعری ہے۔ جس کے وہ خود ہی موجد رہے ہیں۔ "آدمی نامہ" میں جزئیات نگاری بھی کمال کی ہے۔

مجموعی طور پر نظم "آدمی نامہ" نظیر کی ایک عمدہ نظم ہے۔ جس میں انھوں نے آدمی کے مختلف رنگوں اور روپوں کو ایک فلسفیانہ انداز میں بیان کر کے مذکورہ نظم کو لازوال شہرت و مقبولیت عطا کر دی ہے۔

☆☆☆

پھر آخر تنگ آ کر ہم نے   دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

وہ زباں کی طرف سے لاپرواہ تھے اس لیے ان کی زبان پر اعتراض بھی ہوا ہے۔ زبان و بیان کی چند غلطیوں کو چھوڑ کر ان کی شاعری کی مٹھاس، نغمگی، دھیما پن اور اس کا حسن دلوں کو لبھاتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فیض اردو کے بڑے شاعروں میں تھے۔ غلطیاں کس کے یہاں نہیں ہوتیں۔ فیض کے یہاں بھی ہیں مگر اس سے ان کے خوب صورت شاعری اور ان کے مرتبے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بلاشبہ وہ جوش اور فراق کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔

☆☆☆

اکائی: ۲۲

تنقیدی سوالات

نظیر اکبر آبادی

نظم "آدمی نامہ" کا تنقیدی جائزہ

"آدمی نامہ" نظیر اکبر آبادی کی ایک اہم نظم ہے۔ نظیر اردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔ نظیر سے پہلے اور ان کے عہد میں، اگرچہ اردو شعرا نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن جس شد و مد کے ساتھ نظیر نے عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں اس کی مثال اردو شاعری میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنے زمانے کے عام رجحان کے برخلاف ایک ایسے طرز شاعری کی بنیاد ڈالی جسے انھوں نے خود ہی ایجاد کیا اور خود ہی پروان چڑھایا۔ نظیر کی اس تحریک کو عوام الناس کے ہر طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی مکمل نقاب کشائی کی۔ تنگ نظری اور جانب داری سے کام نہ لے کر حیات انسانی کی خوبیوں اور خامیوں پر یکساں اور رندانہ تنقید کی۔ چنانچہ اپنی اسی تحریک شاعری سے انھوں نے شاعری کو عوام سے روشناس کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

نظم "آدمی نامہ" میں نظیر نے آدمی کے مختلف کاموں، پیشوں، برتاؤ اور حالات کو موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے آدمی کے چال چلن اور مختلف مشاغل کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ سے لے کر بھکاری تک سب آدمی ہیں۔ کوئی آدمی خدا کی دی ہوئی تمام نعمتوں سے لطف اٹھا رہا ہے تو کوئی سوکھے ٹکڑے چبا رہا ہے۔ آدمی ہی آدمی کا دوست بھی ہے اور دشمن بھی، آدمی شریف بھی ہے اور بدمعاش بھی، حکمران بھی اور عوام بھی، وہ وقت کی روٹی کے

فیض کی باقاعدہ شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہ دسویں کلاس میں تھے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے دو ایک مشاعروں میں شرکت بھی کی۔

ان کی تقریباً پندرہ شعری اور نثری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "نقشِ فریادی" ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "دستِ صبا" ۱۹۵۲ء میں اور تیسرا "زنداں نامہ" ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ "دستِ تہِ سنگ" ۱۹۶۵ء میں، "سرِ وادیٔ سینا" ۱۹۷۱ء میں، "شامِ شہرِ یاراں" ۱۹۷۸ء میں "میرے دل میرے مسافر" ۱۹۸۱ء اور "کلامِ فیض" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے۔ فیض کا تمام کلام "سارے سخن ہمارے" کے نام سے لندن سے شائع ہوا۔ یہی "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے نہایت خوب صورت کتابت و طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ پاکستان سے شائع ہوا۔ نثر میں "میزان" ۱۹۶۲ء میں "صلیبیں میرے دریچے میں" ان کے انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ "متاعِ لوح و قلم" ۱۹۷۳ء میں "ہماری قومی ثقافت" ۱۹۷۶ء میں "مہ و سال آشنائی" ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ وفات سے پہلے وہ اردو شاعری کا ایک انتخاب ترتیب دے رہے تھے۔ اردو اور انگریزی میں پاکستانی کلچر پر اور اردو میں اقبال کی شاعری پر ایک تنقیدی کتاب لکھ رہے تھے جو پوری نہ ہو سکیں۔

فیض صرف شاعر ہی نہیں تھے وہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار، انگریزی کے کامیاب صحافی اور ایک اچھے ڈرامانگار بھی تھے۔ اُنھوں نے کئی اخباروں میں کام کیا اور کئی اچھے ڈرامے لکھے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کو لینن امن ایوارڈ بھی ملا۔ ان کو دمے کا عارضہ تھا جو جان لیوا ثابت ہوا اور آخر کار اردو کی رنگین نوا ترقی پسند شاعر ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو دوپہر کو ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔

بحیثیت نظم گو۔ فیض کی پندرہ کے قریب نظم و نثر کی تصانیف ہیں جو گراں قدر ادبی خدمات کی گواہ ہیں۔ جوش اور فراق کے بعد وہ صفِ اول کے شاعروں میں سرفہرست تھے۔ ان کی شہرت ان کی خوب صورت اور جاندار شاعری کے سبب ملی۔ اگرچہ نثر میں بھی وہ کسی سے کم نہیں تھے۔ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

لیکن ان کو شہرت ان کی بیشتر نظموں کے سبب ملی۔ نظموں میں اُنھوں نے ہر طرح کے تجربے کیے۔ پابند نظمیں بھی لکھیں اور آزاد بھی۔ قوالی کے انداز کی نظمیں بھی۔ ان کی بہت سی نظموں کو شہرت ملی۔ ایسی نظموں میں "تنہائی"، "نثار میں تیری گلیوں پہ"، "تیرے حسن کے نام"، "صبحِ آزادی"، "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" وغیرہ ہیں۔ اُنھوں نے بہت سی خوب صورت ترکیبیں بھی تراشیں۔ تشبیہات اور استعارات میں ندرت بھی ان کی ایک خصوصیت ہے۔

ان کی شاعری کی اصل خوبی ان کا وہ پیرایۂ اظہار ہے جس میں تغزل کا انداز ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی ندرت اس کے اہم اجزا ہیں۔ بیان میں شگفتگی اور لہجے میں نرمی ہوتی ہے جس سے ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے

تیرگی ہے کہ اُمڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

ان ٹکڑوں میں جو رچاؤ، شگفتگی اور حسن ہے فیض کی نظموں کا وہی سرمایۂ کمال ہے۔ اُنھوں نے غمِ جاناں اور غمِ دنیا کو نہایت خوب صورتی سے آمیز کیا ہے۔ لیکن ہر جگہ اپنے لہجے کے دھیمے پن اور نرمی کے سبب ان میں جان ڈال دی ہے۔ ان کے خیالات جس طرح تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا لے کر شگفتگی کی لہروں پر ڈولتے ہوئے ملتے ہیں اس سے ان کی نظموں کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ ان میں ایک تغزل ہوتا ہے۔ ایہام کا ایسا دھندلکا ہوتا ہے جس سے الفاظ اور تراکیب روشن ہو جاتی ہیں۔ فیض کی بات چیت اور ان کے شعر پڑھنے کے انداز میں بھی دھیما پن اور نرم روی ہے۔

فیض عشق اور انقلاب کی کشمکش میں ہمیشہ مبتلا رہے۔ کبھی عشق نے زور لگایا کبھی انقلاب نے اور وہ دونوں سے اُلجھتے رہے اور آخر کار۔

ہوئے۔ اُن میں آزاد نے نظم کی ماہیت اور اہمیت پر لیکچر دیے اور طرحی مشاعروں کے بجائے موضوعاتی مشاعروں کا آغاز کیا۔ حالی بھی اس سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے "برکھا رت"، "حبِ وطن" اور "نشاطِ امید" جیسی مشہور نظمیں لکھیں۔ بعد میں نظم کی اس روایت کو اسماعیل میرٹھی، نادر کاکوروی، شوق قدوائی، سلیم پانی پتی، سرور جہاں آبادی اور چکبست نے آگے بڑھایا۔ موجودہ صدی کے شروع میں اقبال نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنا ذریعہ بنایا اور ایسے موضوعات اور ہیئت کے تجربے کیے جس سے اسے وسعت اور گہرائی عطا کی۔

اقبال نے نظم کی صنف کو گہرے اور مفکرانہ خیالات کا اظہار کے ذریعہ بنایا ہے۔ اقبال بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے آپ کو دنیا نے قوم سمجھتے ہیں۔ اُن کے دل میں ساری انسانیت کا درد ہے۔ وہ ایک ایسا ہی اور معاشرتی نظام چاہتے ہیں جس میں سب لوگ عزت و آرام کی زندگی گزار سکیں اور انسانی، اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ ملے۔ یہ اُن کی آرزو تھی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اس خیال کا اظہار کیا کہ انسان کے خمیر میں بے پناہ قوت موجود ہے۔ وہ یقینِ محکم اور عمل سے موجودہ صورتِ حال کو بدل سکتا ہے اور وہ اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں بنا سکتا ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ انسان اپنی خودی کو بیدار کرے اور خود شناسی کے ذریعہ تمام رکاوٹوں پر قابو پالے۔ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے ہمیں نہ صرف قوتِ عمل اختیار کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ زندگی کے پیچیدہ مسائل پر بھی اپنی رائے دی ہے۔ ایک بڑے فن کار کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کی الفاظ کے ذریعے تصویر کشی کرے۔ اور ان کے دل و دماغ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے جو اس فن کار کے ذہن پر طاری ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال کا شمار دنیا کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اپنی نظموں کے ذریعے انھوں نے نہ صرف اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ اُردو شاعری کا درجہ بھی بلند کیا ہے۔ اس بنا پر اردو نظم نگاری میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا ہے۔

اکائی: ۲۱

فیض احمد فیض

سوانح عمری: فیض احمد فیض کا شمار اُردو کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ کالا قادر گاؤں (پنجاب، پاکستان) میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی انداز سے ہوئی۔ چار برس کی عمر میں انھوں نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ ایک سال بعد انھیں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں انھوں نے پانچ سال تک عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں اسکاچ مشن ہائی اسکول میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے ۱۹۲۷ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں بی اے پاس کیا۔ پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۳ء میں امرتسر کے ایم اے او کالج میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے اُستاد مقرر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں فیض فوج میں داخل ہو گئے اور بحیثیت کیپٹن دہلی آ گئے۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں لفٹیننٹ کرنل بنا دیے گئے۔ فوج میں بہتر کارکردگی کے سبب برٹش گورنمنٹ نے انھیں ۱۹۴۶ء میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب دیا۔ (Order Of British Empire Member) ۱۹۴۷ء میں وہ فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ اُردو روزنامہ "امروز" کی بھی ایڈیٹری کی۔ ۱۹۴۱ء میں فیض نے ایک انگریزی خاتون ایلس کیتھرائن جارج سے شادی کر لی۔

۱۹۵۱ء میں فیض اور ان کے دوسرے فوجی ساتھی راولپنڈی سازش کے تحت گرفتار ہو گئے اگرچہ وہ بے گناہ تھے مگر کئی سال تک نظر بند رہے جہاں انھوں نے بہت سے شعر کہے۔

تو اقبال بھی اس میں ضرور شریک ہوا کرتے تھے۔ جس زمانے میں اقبال نے شاعری شروع کی اس زمانے میں داغ کی شاعری کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا۔ اقبال نے بھی ابتدا میں اُن سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کر دی۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں داغ کا روایتی انداز جھلکتا ہے لیکن جلد ہی اقبال نے اپنی انفرادیت قائم کر لی۔ اور "بالِ جبریل" تک آتے آتے اُن کے اسلوب میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہو گئی۔

اقبال کا دردمند دل اور قومی و ملی جذبات سے معمور تھا۔ وہ انقلاب کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے وطن سے محبت اور وطنیت کا احساس دلایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان پر قابض تھے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی اور ہندوستانیوں کو غلامی کا احساس دلا کر انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔

حکومت ہند نے اقبال کو ان کی سیاسی اور علمی و ادبی خدمات کے لیے سر کے خطاب سے نوازا اور 1923ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ کھانسی، دمہ اور گردے کی تکلیف کے باعث 21 اپریل 1938ء کو انتقال کر گئے۔

ادبی خدمات: دنیا میں کبھی کبھی ایسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنے گرد و پیش اور ماحول کو بدل دیتی ہے۔ بلکہ دنیا کی فکر و نظر میں بھی تبدیلیاں لانے کا باعث بنتی ہیں۔ علامہ اقبال بھی ان ہی باکمال لوگوں میں سے ایک تھے۔ اُن کی ادبی خدمات اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف نئے موضوعات اور خیالات کو اردو شاعری میں پیش کیا بلکہ پرانے الفاظ و تراکیب کو نئی وسعت عطا کی۔ انھوں نے اپنے کلام میں دیانت داری اور خودداری کا بھی سبق دیا ہے۔ اُن کا پیغام "عمل" ہے۔ ناامید ہو کر بیٹھ جانے والوں کی وہ شفقت کے ساتھ اُمید دلا کر پھر میدانِ عمل میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اقبال زندگی کے تعمیری پہلو پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ انسانیت پر جبر و ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اردو کے شاعر ہیں۔

اقبال نے اردو شاعری میں نہ صرف نئے خیالات کا اضافہ کیا بلکہ آرٹ، تاریخ اور فلسفے کو اس طرح خوش اسلوبی سے شاعری میں سمویا کہ شاعرانہ مصوری کی نہایت عمدہ مثال ملتی ہے۔

اقبال کو منظر کشی میں بھی کمال حاصل ہے۔ وہ لفظوں کے قلم سے فطرت کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ انھوں نے

اپنے کلام میں زندگی کی وسعت جس قدر آئینہ، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں ان کی مثال اردو اور فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

اقبال کی غزلیں روحانیت اور واقعیت کا خوش گوار سنگم "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کی غزلوں میں سیاست، حیات اور کائنات کے عالمگیر مسائل مشرق و مغرب کی آویزش نئے ذہن اور نئے وجدان کے لیے نقوش ملتے ہیں جو خود اردو شاعری میں ایک باب کا اضافہ کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں بعض روحانی اور اخلاقی مقصد میں ان کی شاعری کے ذریعے ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعے سے فطرت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اقبال کے اپنے اشعار میں الفاظ کی ترتیب اس خوبی سے کی ہے کہ ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ فلسفے جیسے خشک مضمون کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ ترنم کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں جذباتی رنگ زیادہ ہے لیکن اُن کے ساتھ خلوص بھی ملتا ہے۔ وہ جذبہ و خلوص کے ساتھ ساتھ اُن کے تخیل کی رنگینی سے اُن کے آرٹ میں جان پڑ جاتی ہے۔ اقبال شاعرِ حیات ہیں۔ زندگی کو نئی وسعت دینے اور اُسے نئی توانائی بخشنے اور سنوارنے کی جو کوشش انھوں نے کی ہے اس کی اردو شاعری میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔

نظم گوئی میں اقبال کا مرتبہ: ولی، میر اور غالب کے بعد اردو شعر و ادب کی کوئی عظیم دین ہے تو وہ اقبال ہیں جو شاعر ہی نہیں مفکر بھی ہیں اور اس لحاظ سے اقبال نے اردو شاعروں میں سب سے بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بھی انتہائی بلند مقام ہے جتنی فارسی ادب میں حافظ اور سعدی کی اور انگریزی شعر و ادب میں ملٹن اور ورڈز ورتھ کی ہے۔ جیسے ، برگساں اور خوش فکر رومی کی طرح اقبال بھی اپنا فلسفۂ حیات رکھتے ہیں۔

اقبال نے بلاشبہ اردو نظم کے مزاج اور آہنگ میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔ انھوں نے بالخصوص اردو نظم کو معنوی اعتبار سے نئی بلندیوں اور وسعتوں سے آشنا کیا۔ اقبال کے بعد آنے والے نظم نگاروں نے اقبال کی بیش قیمت خدمات کا اعتراف کیا اور ان سے اثر قبول کیا۔

اقبال نے اپنے بیشتر تجربات و خیالات کا اظہار نظم میں کیا ہے۔ ان کے زمانے میں نظم خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ ان کے معاصرین میں چکبست، سرور جہاں آبادی، جوش، سیماب اور اختر شیرانی مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ رہے تھے۔ نظم کو ایک باقاعدہ صنف کے طور پر انیسویں صدی میں آزاد اور حالی نے متعارف کیا تھا۔ انجمن پنجاب کے تحت جو ادبی جلسے

سے استعارات و تشبیہات پیش کرتے ہیں۔ قاری کا ذہن بھی ان چیزوں سے آشنا ہوتا ہے اور اس سے اُن کے کلام میں بھی ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ چکبست نے اپنے احباب اور جاننے والوں پر مرثیے بھی کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں اُنھوں نے اپنے جذبات کا نہایت دردمندی سے اظہار کیا ہے۔ ایک اور خوبی جو اُن کے کلام میں نہایت آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے وہ ہے ان کا سیاسی اور سماجی شعور۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں اپنے زمانے کے سیاسی اور قومی واقعات کو نہایت کامیابی اور شاعرانہ تاثیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس میں وہ عربی الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور اپنی آزادیٔ رائے کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں۔

چکبست کی قابلِ ذکر نظمیں "وطن"، "فریادِ قوم"، "ہمارا وطن"، "آوازِ قوم" اور "خاکِ ہند" ہیں۔ ان میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں "برسات"، "کشمیر"، "سیرِ دہلی" اور "رامائن کا ایک سین" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن سے چکبست کے مشاہدے کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔

نظم نگاری میں چکبست کا مرتبہ:

چکبست نہ صرف ایک شاعر بلکہ اپنے زمانے کے ایک ممتاز وکیل بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے شاعری کو موضوعات بنایا۔ اُن کی شاعری میں عشق و محبت کے افسانوں کے بجائے سیاسی، قومی اور تہذیبی روایات کا اظہار ملتا ہے۔ چکبست نے کسی گہرے فلسفیانہ نظریے کو اقبال کی طرح اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ اُن کی شاعری کی گہرائی ذہنی وسعت کا پتہ نہیں دیتی بلکہ وقتی جذبوں کی ترجمان ہے۔

چکبست کی نظموں کی تعداد بھی مختصر ہے۔ اُنھوں نے "حبِ وطن" کے موضوع پر چند نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن اس موضوع کو برتنے میں اُنھوں نے کسی جدت سے کام نہیں لیا۔ اُن کا حب الوطنی کا جذبہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے اور اُن کی نظموں کے آئینے میں اس دور کے سیاسی حالات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ان نظموں سے اُن کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور اس سے اُن کی حب الوطنی کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ چکبست بڑے فنکار تو نہیں ہیں لیکن حب الوطنی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات اور فطری حُسن کو اُردو شاعری میں جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کارنامے کو نہیں بھلایا جا سکتا۔

اکائی: ۲۰

علامہ محمد اقبال

سوانح عمری: اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کشمیر تھا جہاں سے وہ اٹھارہویں صدی میں ہجرت کر کے سیالکوٹ چلے گئے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے رواج کے مطابق مکتب سے شروع ہوئی۔ آپ کے والد شیخ نور محمد کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے لیکن علم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ دل کے وہ صوفی تھے اور اپنے دین و مذہب سے بھی انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ اقبال کی تعلیم و تربیت میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا۔

دوسرا اپنی ابتدائی تعلیم میں مولوی میر حسن جو کہ ایک عالم بزرگ تھے، سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اقبال بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ ہر امتحان اُنھوں نے نمایاں کامیابی سے پاس کیا اور بہت سے انعام، تمغے اور امتیازات وغیرہ حاصل کر کے اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا۔ مشن اسکول سیالکوٹ سے ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ انھیں فلسفے کے ماہر استاد آرنلڈ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں اُنھوں نے آرنلڈ سے فلسفے میں بہت کچھ سیکھا۔ آپ کو فلسفے سے خاص دلچسپی تھی۔ بی اے کے بعد ایم اے میں فلسفے ہی کو بطور مضمون اختیار کیا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد چند دنوں کے لیے اورینٹل کالج لاہور اور بعد میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہو گئے۔

1905ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ یورپ روانہ ہو گئے جہاں سے 1907ء میں اقبال نے میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ انگلستان کے اسکول آف پولیٹکل سائنس سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے 1908ء میں ہندوستان واپس آئے۔

اقبال نے زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ کبھی کبھار سیالکوٹ میں چھوٹا موٹا مشاعرہ ہوتا

پیش کیا ہے۔ ''خاکِ وطن'' سے محبت کے اظہار میں ایک ایک لفظ سے عقیدت ومحبت کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔ ان کا کلام مبالغہ سے پاک اور حقیقت لیے ہوئے ہے۔ خیالی باتوں کی جگہ عموماً زندگی کے روزمرہ واقعات دلچسپ طریقے سے جگہ پاتے ہیں۔ طرزِ بیان میں فارسی تراکیب سے چستی اور روانی پیدا کر دیتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے شعر میں ترنم اور کیف پیدا ہوتا ہے۔ ان کا کلام وطن دوستی، آزادی، مہر فطرت کا سرچشمہ ہے۔ ان میں ہندوستانیت اور وطنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

ان کی ایک نظم ''گنگا'' کا ایک بند دیکھیے:

او پاک نازنیں! او پھولوں کے گہنے والی!
سر سبز وادیوں کے دامن میں بیٹھنے والی!
او ناز آفریں! او صدق و صفا کی دیوی!
او عفت مجسم! پریت کی رہنے والی!
صلی اللہ یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانہ او چپ نہ رہنے والی!

☆☆☆

اکائی ۱۹:

چکبست

سوانح عمری: چکبست فیض آباد میں 1882ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ 1905ء میں چکبست نے کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور 1908ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے وکالت کے میدان میں قدم رکھا اور اس پیشہ میں اس قدر کامیابی حاصل کی کہ لکھنؤ میں ان کا شمار بہترین اور مایہ ناز وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔ شاعری کا لگاؤ بچپن ہی سے تھا اور یہ شوق مرتے دم تک ساتھ رہا۔ 1926ء کو ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں بریلی گئے ہوئے تھے، دوپہر تک مقدمے کے سلسلے میں عدالت میں بحث کی اور پھر واپس لکھنؤ آنے کے لیے اسٹیشن آئے۔ ریل میں بیٹھتے ہی تھے کہ فالج گرا اور زبان بند ہوگئی اور کچھ گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر ہی انتقال ہوگیا۔ گیارہ بجے رات ان کی میت ایک موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لائی گئی جہاں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ادبی خدمات: چکبست نے اپنی شاعری میں سیاسی وقومی تحریکوں کو خوب صورتی سے پیش کیا ہے بے شک چکبست کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی انھوں نے پیش کیا ہے بہت خوب صورت ہے۔ ابتداء میں وہ غالب، آتش اور انیس سے استفادہ کرتے رہے۔ ان عظیم شعراء کے انداز بیان سے چکبست نے جو کارہائے نمایاں اردو شاعری میں انجام دیے۔ وہ ان کی انفرادی خصوصیات سے لبریز ہیں۔ چکبست کے یہاں حسن وعشق کے افسانے بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا خاص مقصد لوگوں کے اندر حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کرنا تھا۔ اس لیے وہ غزلوں میں بھی اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

چکبست کی شاعری کا دوسرا دلفریب منظر نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ہندوستان ہی کے واقعات اور فطری مناظر

اکائی: ۱۸

دُرگا سہائے سرور جہاں آبادی

سرور جہاں آبادی کی نظم نگاری:۔ سرور جہاں آبادی اردو نظم نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اردو نظم کے ارتقا میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ اردو اور فارسی ادب کے مطالعے نے آپ کے دل کے اندر شعر و شاعری کا شوق پیدا کر دیا۔ آپ شعر و شاعری کرنے لگے۔ اس وقت آپ کے دل میں انگریزی زبان بھی سیکھنے کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے ایک پوسٹ ماسٹر صاحب سے انگریزی زبان پڑھی اور جدید انگریزی ادب اور خاص کر منظوم ادب کا مطالعہ کیا۔ اس دور میں آپ نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ دی اور با کمال شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ آپ کو غزل اور نظم دونوں پر عبور حاصل تھا۔ پھر بھی آپ کی نظمیں زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ آپ جو کچھ بھی محسوس کرتے تھے اسے نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے "خمخانۂ سرور" اور "جام سرور" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سرور کی بیشتر نظموں کا موضوع حب الوطنی پر مبنی ہے۔ انھوں نے وطن کے بے پناہ نغمے گائے ہیں۔ سرور صاحب نے اپنی نظموں میں نئے نئے خیال پیش کیے ہیں۔ ان کے ہم عصر نظم نگاروں نے بھی حب الوطنی پر نظمیں لکھی ہیں لیکن سرور کا انداز ہوتا کچھ الگ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی درج ذیل نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حسرت وطن، اعزاز حب وطن، مادر ہند، خاک وطن، وطنیت، حب الوطنی، قومی نوحہ وغیرہ اجتماعی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ سرور کی نظموں میں جلوہ امید، الحذر، غربت، جنگل اور میں، پھولوں کا کنج، بدنصیب بنگال وغیرہ اہم ہیں۔

انگریزی ادب کے زیر اثر آپ نے قدرت کے نظاروں اور فطرتی حقائق کی خوب ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا ہے اور اپنے احساسات کو نہایت ہی شیریں زبان میں بیان کیا ہے۔ سرور جہاں آبادی نے زبان اور فن کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی زبان میں روانی اور شگفتگی کافی ہے۔

سرور صاحب کی زندگی مصیبتوں سے بھری پڑی ہے۔ شادی کے دو سال بعد آپ کی بیوی آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اس جہان فانی سے چلی گئیں۔ جس سے آپ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آپ نے دوسری شادی نہیں کی تاکہ اس کے بطن سے پیدا ہوئے لڑکے کو کوئی عورت سوکن کے بچے کو تنگ نہ کرے۔ بد قسمتی کی وجہ سے بیٹے کا بھی جلدی وفات پا گیا۔ بیٹے اور بیوی کی وفات کے بعد سرور صاحب کی دنیا تاریک ہو گئی۔ غم کو غلط کرنے کے لیے شراب نوشی کا سہارا لیا۔ آخر شراب نے آپ کا کام تمام کر دیا۔ اور سرور بھرپور جوانی میں ۱۹۱۰ء میں وفات پا گئے۔ اگر زندگی وفا کرتی تو سرور نے اردو ادب خصوصاً اردو نظم کی کافی خدمت کی ہوتی۔

انگریزی ادب سے متاثر ہو کر سرور نے لگ بھگ بیس سے تیس نظموں کے لیے یا تو انگریزی نظموں یا انگریزی خیالوں سے استفادہ کیا۔ انگریزی ادب کے استفادے سے سرور کے کلام میں ایک رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔ موسم بہار کا آخری پھول، موسم سرما کا آخری گلاب، مرغابی یا بچپن کی یاد، میری کتابیں، آنے والی گھڑی، سال گذشتہ وغیرہ نظمیں اردو ادب میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ظرافت بھری پڑی ہے۔

جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو اس تحریک سے ادیب، شاعر بھی بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے بھی اس تحریک میں برابر کا حصہ ڈالا۔ ان کے علاوہ پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں ہندوستان کی بے چارگی اور بے بسی کا احساس تیز ہو رہا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی، آزاد کے علاوہ سرور جہاں آبادی نے بھی وطن دوستی کے گیت گائے۔ اور ان کی شاعری خصوصاً نظموں میں ہندوستانی روح اپنے پورے جوبن کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

سرور جہاں آبادی کی نظم نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی درج ذیل نظمیں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ مادر وطن، گنگا جی اور جمنا جی، پدمنی، لکشمی جی، سیتا جی کی گریہ وزاری، سوز جوگی وغیرہ۔

سرور نے غزلوں کے مقابلے میں نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ آپ نے مختلف مسائل لے کر اپنے کلام میں ندرت اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی چیزوں کو سامان صد افتخار خیال کر کے اپنے کلام میں ممتاز جگہ دی ہے۔ انھوں نے جہاں جنگل، قمری، فرات، بلبلے و تمریں کو اپنے کلام میں سراہا ہے وہاں کوئل، بھونرا، جگنو، سارس، مرغابی، گنگا، جمنا اور پدمنی کو بھی ان کے مقابلے میں

قوم کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔

اکبر الٰہ آبادی کی کامیابی اُن کی خاص اصطلاحات میں پوشیدہ ہے جس کی آڑ میں وہ بڑے سے بڑے مطالب بیان کر جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں بدھو، جمن، شیخ جی، ڈارون صاحب، لیڈر، ووٹ، کونسل، مسلمان وغیرہ الفاظ بار بار نہایت لطیف پیرایہ میں ملتے ہیں۔

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اکبر نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے لیکن نہایت کامیابی کے ساتھ۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

پارکوں میں بہار درختوں کی دیکھ لی
کالج میں آئے کانووکیشن کو دیکھیے

اکبر کے کلام کا خاص موضوع تعلیم نسواں اور بے پردگی ہے۔ اُن کے زمانے میں جو اندھا دھند مغربی تہذیب کی تقلید ہو رہی تھی۔ اکبر نے اس کی مخالفت کی:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

غرض اکبر طنز و ظرافت کے بادشاہ تھے۔ اُن کی شاعری "مقصدی شاعری" ہے۔ اُردو ادب اور قوم ہمیشہ اکبر کی احسان مند رہے گی۔ انہوں نے اُردو نظم کو طنز و مزاح کے اسلوب سے نئے امکانات سے واقف کرایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی چھوٹی چھوٹی نظموں میں فطرت کی مصوری کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ اُن کی نظم "ایک فرضی لطیفہ" بھی ایک پڑھنے کی چیز ہے۔ اس میں اکبر اپنے موقف کی وضاحت کرتا ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو اُن کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

امتحانی سوالات:

۱۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظم نگاری پر ایک نوٹ لکھیے؟

۲۔ اکبر الٰہ آبادی کی حیات اور اُن کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں؟

۳۔ اکبر الٰہ آبادی طنز و ظرافت کے شاعر ہیں؟ کہاں تک صحیح ہے؟

۴۔ اکبر الٰہ آبادی کی زبان و بیان پر تبصرہ کریں؟

کلام کی خصوصیات: اکبر کے کلام میں معاملہ بندی، پاکیزگی اور شائستگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی ہے

محروم ہی رہ جاتی ہے آغوش تمنا
شرم آ کے چرا لیتی ہے سارا بدن ان کا

اکبر کے کلام میں بلا کا تغزل ہے:

ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جب تمہارا خیال آتا ہے ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں
مجھ کو کچھ پوچھنا ہے اکبر سے یہ کبھی ہوش میں بھی آتے ہیں

اکبر کی غزلیں ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اکبر کی شاعری زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اکبر کی نظر نہ گئی ہو۔ اکبر کا قوی تخیل، ذہانت اور فراست سے آراستہ ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں قومی شاعر تھے۔ اکبر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سچائی، خلوص اور صاف گوئی ہے جو انہیں دوسرے نظم نگاروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔ وہ صاف بات کہہ دیتے ہیں:

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

اکبر کے کلام کی دوسری خصوصیت طنز و مزاح ہے۔ ظرافت اکبر کے کلام کی روح ہے۔ اردو ادب میں ظرافت ہم کو اکبر سے پہلے سودا، انشا، غالب اور اودھ پنچ میں مل جاتی ہے۔ ان کے قہقہے بلند اور بعض جگہ مصنوعی ہوتے ہیں۔ اکبر کی طنز و ظرافت کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اکبر نے ظرافت کے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ یہاں ظرافت کی چند مثالیں پیش ہیں:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

☆

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ان کے ظریفانہ کلام میں درد و کسک بھی ہے اور نصیحت کی تلخی اور ناخوشگواری بھی۔ ان کا طرز بیان اس قدر دلکش ہے کہ پند و نصائح کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں نازک خیالی اور بندش نہیں ہے۔ اپنے مطلب کو نئے الفاظ اور نئے طرز بیان سے انہوں نے چٹکلوں جادو بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں انگریزوں کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ لیکن ان کو نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ اور اپنی زبان کا جز اس طرح بنا دیا ہے کہ پڑھنے والے کو نامانوسیت الفاظ کا احساس نہیں ہوتا۔ انہوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں حکومت وقت کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کیا۔ انکی سیاسی چالوں سے قوم کو آگاہ کیا۔ اس پر تنقید کی نیز ہندوستانیوں کے رویوں میں جہاں کمی اور کجی نظر آئی انہوں نے اس کی نشاندہی بھی کی۔ اکبر کی شاعری کا اصل مقصد قوم کو اندھی تقلید سے باز رکھنا تھا تاکہ ماضی میں اپنی تہذیب اور مذہب سے اس کا رشتہ نہ ٹوٹے۔

سرسید احمد خاں نے جو تحریک چلائی تھی جو کہ مغرب کی عقلیت پسندی اور مذہبی لبرل ازم پر مبنی تھی اور ان خیالات کو وہ زور و شور سے اپنی قوم میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اکبر الہ آبادی ان کی جدت پسندی کو اسلام کی مغربی تعلیم و تہذیب کی تحریف کی کوبالا کرنا چاہتے تھے اور اس کے نقصان دہ پہلوؤں کو دکھانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف سرسید کی نظروں میں مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالت کے بہتر ہونے کی انگریزوں کی تعریف اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی۔ سرسید احمد کا دل مسلمانوں کی تباہ حالی اور پستی پر کڑھتا تھا جن کے پاس نہ وہ علم تھا جو زمانے کا ساتھ دے نہ تجارت تھی نہ سرکاری نوکریوں کی اہلیت اور نہ روحانی و اخلاقی قوت غرضیکہ سرسید کو اپنی

کروٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جو طنز و مزاح کے لیے وقف کر دی۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی نظم "مدرسہ علی گڑھ" اور "مس سیمیں بدن" "کلیسا" کر انگریزی تعلیم پر خوب پھبتیاں کسی ہیں۔ جو طنز و مزاح کی صنف بنیادی طور پر شاعر کے ذاتی اختلافات کا یا اس کے بعض معاملات کا ایک نشانہ رہی تھی۔ چنانچہ بڑے بڑے شاعروں کی لکھی ہوئی ہجویات بھی بدمذاقی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے ہاں ہمیں پہلی بار طنز اور مزاح دونوں شاعر کی ذات کی تنگ اور محدود دنیا سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ محض ایک انداز بیان ہی نہیں۔ وہ اسے سماجی تبدیلیوں کو پرکھنے اور سمجھانے کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں محض تمسخر نہیں اور مضحکہ نہیں بلکہ سنجیدگی، شائستگی اور تفکر کی بھی چھاپ ہوئی ملتی ہے۔ اکبر کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد سے ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نقطۂ نظر کو ہر شعبے پر منطبق کر کے زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چنانچہ شعر و ادب کو بھی سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا گیا۔

سرسید تحریک کے علمبرداروں نے اور اکبر نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی کوشش کی۔ سماجی اعتبار سے متضاد نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود سرسید، حالی اور اکبر یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔

اکبر الہ آبادی اپنے دور کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ خصوصاً مغربی اثرات کے تحت چلنے والی جدید اقدار کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کی مدد سے وہ ان پہلوؤں کا اور زیادہ مضحکہ بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک کارٹونسٹ اپنے اسکیچ میں بعض خطوط کو گھٹا بڑھا کر ان پہلوؤں کو نمایاں کر دیتا ہے جن پر طنز کرنا مقصود ہو۔ اسی طرح اکبر بھی نئی تہذیب کی خامیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں۔ نظم میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر مبالغہ سلیقے اور تناسب کے ساتھ ہو۔ اس فن کی جان ہے۔ یہ مبالغہ اس اعتبار سے حقیقت آمیز ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے زندگی، شخصیت یا کسی شے کے مختلف خارجی و داخلی عناصر کے اس عدم تناسب کو سب کی نظروں میں عیاں کیا جا سکتا ہے۔ جو پیچیدگیوں میں اس قدر پنہاں ہوتا ہے۔ اکبر کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے باوجود کہ ان کے خیالات سے آج اتفاق نہیں کیا جاتا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید اتنا بھی اتفاق نہ رہے جتنا آج ہے۔ مغربیت کی جن خامیوں کا انہوں نے مذاق اڑایا ہے، خصوصاً مغرب کی اندھی پیروی اور ظاہر پرستی پر جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس سے اختلاف ممکن نہیں۔ اکبر

اپنے اشعار کے آئینے میں ہمیں ہماری ایسی شکل دکھاتے ہیں کہ ہم خود اپنی حالت پر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں:

تاکید عبادت پہ یہ سب کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

اکبر الہ آبادی کی شاعری اپنے دور کی آئینہ دار ہے۔ اکبر نے غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کو شہرۂ آفاق ان کی ظریفانہ شاعری نے ہی بنایا۔ اکبر کی شاعری قومی شاعری ہے۔ لیکن ابتدائی کلام میں غزل ملتی ہے۔ جو کہ کیف و سرور، معاملہ بندی، رنگینی اور توحید و معرفت سے لبریز ہے۔

اکبر کے مزاج کی بلا کی شوخی ان کی غزلیات میں بھی موجود ہے۔

حسن کے باب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو اب کیسن کو پری کہتے ہیں

زبان و بیان: اکبر کو زبان پر بلا کی قدرت تھی۔ انہوں نے عام بول چال کی زبان اور انگریزی کے رائج الفاظ کا اس قدر برجستہ استعمال کیا اور ان کے ذریعے اس خوبی سے مزاح کا کام لیا کہ ان سے پہلے شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ ایک بڑے طنز نگار یا مزاح نگار کی ایک لازمی صفت یہ ہے کہ اسے اپنے میڈیم (Medium) یا وسیلہ اظہار پر اتنا قابو ہو کہ وہ اس کے ان دیکھے پہلوؤں کی طرف پڑھنے والے کے ذہن کو متوجہ کر کے ایک انوکھا تاثر پیدا کر سکے۔

اکبر کے ہاں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال خصوصاً قابل توجہ ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعے انگریز پرست ہندوستانیوں پر دلچسپ اور برمحل چوٹیں کی ہیں۔

اکبر نے ابتدا میں روایتی انداز کی غزلیں بھی بہت کہی ہیں۔ جن کے بعض اشعار آج تک زبان زد ہیں اور لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ اشعار اکبر جیسے شاعر کے ہوں گے۔ فنی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں اور ان سے اکبر کی شخصیت و مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات: کلیات اکبر کی تین جلدیں ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ پھر اس کے اور ایڈیشن بھی شائع ہوتے رہے۔ چوتھی جلد پہلی بار ۱۹۴۸ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی جس کے وجود کا عام لوگوں کو علم نہیں ہے۔

اکائی: ۱۷

اکبر الٰہ آبادی

حیات: ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی تہذیب وتمدن ہندوستان کی معاشرت اور طرز بود و باش وغیرہ پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ آج تک اس کا اثر نمایاں ہے۔ ساری مشرقی تہذیب جوکہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس مغربی سیلاب کی نظر ہوگئی۔ مشرق پر مغرب کا پورا جادو ہو گیا تھا۔ انگریزی کھانے بھی لذیذ تھے۔ اور چست کپڑے بھی پسند کے موافق۔

ہندوستان میں مسلمان خاص طور پر اس تہذیب سے اثر انداز ہوئے۔ وہ ماضی کو بھول گئے۔ حال کا ان کو ہوش نہ رہا۔ مستقبل کی فکر نہ تھی۔ انھیں انگریزی تہذیب دیتی اور جن جن کا ہاتھ پہنچا تو سب کچھ پسند تھا۔

سید اکبر حسین اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو الٰہ آباد کے نزدیک بارہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ والدین نے ابتدائی تعلیم تو مشرقی انداز کی دلوائی تھی مگر خود انہوں نے ذاتی لیاقت اور دلچسپی کی بنا پر انگریزی سے بھی اچھی واقفیت حاصل کر لی۔ شروع شروع میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ پھر عدالت سے وابستہ ہوئے وکالت کا امتحان دیا اور سیشن جج کے عہدے تک ترقی کی۔ ہائی کورٹ کی ججی کا بھی موقع آیا مگر خرابیٔ صحت کی وجہ سے پہلے ہی ریٹائر ہو گئے۔ اس دور کے شرفا کی طرح ان کی جوانی بھی خاصی رنگین تھی اور شاعری میں بھی اس کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو ان کے سامنے مغرب کی تہذیب سب پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ وہ حساس دل رکھتے تھے۔ اپنے گرد و پیش کو دیکھا، خوب دیکھا، خود کو دیکھا، قوم کو پہچانا اور احساس کیا کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے۔

قوم کی کشتی ایسے بھنور میں پھنس گئی تھی جہاں فوراً کسی ناخدا کی تلاش ہے۔ ویسے ہی وقت میں قدرت نے سرسید کو ناخدا بنا کر بھیج دیا تھا۔ سرسید اور ان کے ادبی رفقا نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ حالی واعظ ہو گئے اور اپنی موثر نظم میں رلا کر قوم کو رلاتے رہے لیکن آنسوؤں کے بعد بھی ان کے آنسو بے اثر ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر سر

اقبال کی نظموں نے بھی خاطر خواہ کام نہیں کیا۔ نذیر احمد کی ناول نگاری نے قوم کو کشمکش میں ڈال دیا۔

اکبر الٰہ آبادی نے بہت خوب کیا۔ انھوں نے نہ تو خشک وعظ کہے نہ پند و نصائح سے کام لیا۔ قوم کی اس حالت پر آنسو بہانے کے بجائے خوب قہقہے لگائے۔ خوب ہنسے خوب ہنسایا اور اتنا ہنسایا کہ آنسو نکل پڑے اور اس گدگداہٹ کے ساتھ ہی طنز کا نشتر گھونپ دیا۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی زندگی میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے آغاز و اختتام اور تحریکات خلافت و عدم تعاون تک سب کچھ نہ صرف دیکھا بلکہ ذاتی فکری طور پر ان میں دلچسپی بھی لی۔ عدالتوں سے وابستگی کی بدولت انگریز حکام اور ان کے کلام میں ان سب تجربات و مشاہدات کے بہت واضح اثرات ملتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے زمانے میں مغربی تہذیب، سامراجی سازش کا ایک روپ بن کر سامنے آئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نقلی انگریزیت کا طرح طرح سے مذاق اڑایا۔ اکبر کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو الٰہ آباد میں ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

اکبر الٰہ آبادی انگریزی سرکار کے ملازم تھے۔ کچھ زبان سے کہہ دینا محال تھا۔ مگر ذہن رسا اور ذوق سلیم نے رہنمائی کی۔ انھوں نے کنایہ، اشارات، تشبیہ و استعارات سے کام لیا۔ جمن، بدھو، چھٹو، لال جی اور شیخ جی جیسے کردار گڑھے۔

بقول اکبر الٰہ آبادی کے انگریز تو ہندوستانیوں کو عہدے دے کر گویا چپکی بنا لیتے تھے:

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لیا لپٹے ہیں دل
تیغ نہایت خوشنما وہ بھی اُن کے ہاتھ میں

اکبر الٰہ آبادی کا ذہن اس بات کو برداشت نہ کر سکا کہ لوگ مغربی تہذیب کی تقلید میں اپنی قومی روایات بھول بیٹھے ہیں۔ مذہب اور خدا سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں جس سے ہندوستانی گھر تباہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس سے متاثر ہو کر ظرافت کی چٹکیوں سے قوم کو جھنجھوڑا۔

طنز نگاری: اکبر اس وقت تک اردو میں طنز و مزاح کے سب سے بڑے شاعر رہے ہیں۔ اُن سے قبل اردو شاعری میں یہ عناصر عموماً غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے تھے جن کا نشانہ زیادہ تر واعظ، محتسب، رقیب یا خود عاشق و معشوق ہوا کرتے تھے۔ مگر وہاں طنز و مزاح محض شاعر کے انداز بیان کے ایک پینترے یا اس کے تخیل کی بس ایک

سرسید سے ہوئی۔ اُن سے متاثر ہو کر حالؔی اُن کے مشن میں شامل ہو گئے۔ اور اُن کی شخصیت پر سرسید کی گہری چھاپ لگ گئی۔ اُن کی ہی فرمائش پر حالؔی نے "مسدس مدوجزرِ اسلام" لکھی۔ بعد میں حیدرآباد سے حالؔی کو ادبی وظیفہ ملنے لگا اور انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد پانی پت میں آ کر زبان و ادب کی خدمت کرنے لگے۔ 1902ء میں حکومت نے "شمس العلما" کا خطاب دیا۔ ستر برس کی عمر میں 31 دسمبر 1914ء کو زبان و ادب کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اور پانی پت میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔

شاعرانہ عظمت: حالؔی ایک بلند مرتبہ شاعر اور جدید شاعری کے بانی تھے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا دہلی کے قیام کے دوران مرزا غالبؔ سے ملاقات ہوئی۔ مرزا کی صحبت نے حالؔی پر بہت بڑا اثر کیا۔ مرزا غالب کی ہمت افزائی نے حالؔی کی شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ اس کے بعد حالی سے شیفتہ کو شعر و سخن کا بہت پاکیزہ ذوق تھا۔ ان کی صحبت نے حالؔی کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ آزاد نے جدید شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور آزادی کوششوں سے جدید شاعری کا ایک دھندلا خاکہ بنا تھا۔ اس خاکے کو مکمل صورت دینے کا فخر حالؔی کو حاصل ہے۔ حالؔی خود اچھے شاعر تھے اور سوز شاعری کے رازدان تھے۔ اس لیے انھوں نے اُردو شاعری کو اسالیب کو بدل دیا۔ مسدس حالؔی اُردو میں قومی شاعری کی اہم خصوصیت جذبہ حب وطن ہے۔ اُن کے اشعار میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حالؔی کی شاعری سے اُردو شاعری میں ایک انقلاب آ گیا۔ حالؔی فن شاعری اور نقدِ شعر میں اعلیٰ پایہ کے صاحب نظر و کمال تھے۔ حالؔی کے دیوان میں غزلیات میں مومنؔ اور غالبؔ کی نزاکت اور لطافت کا اثر بھی ہے۔ اور دوسرے مصحفؔی کی سادگی اور جاذبیت بھی ہے۔ حالی کی شاعری کا کمال طرزِ بیان کی جدت، سوزنیت و لطافت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ حالؔی کی شاعری اعلیٰ پایہ کی شاعری ہے۔ حالؔی جدید اُردو شاعری کے امام اور بہت بڑے محسن تھے۔ نئے مضامین اور نئے اسلوب بیان سے انھوں نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا۔ اُن کی غزلیات میں جدید رنگ پایا جاتا ہے۔ سادگی، پرکاری، اعتدال، اختصار، سلاست، لطافت، بے تکلفی اور ترنم اُن کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ منظومات حالؔی اُردو ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے جن میں منظر نگاری، واقعہ

نگاری، سیرت نگاری، جذبات نگاری، فلسفہ صداقت پسندی، اخلاق تعلیم اور سادگی بلند درجہ پائی جاتی ہے۔ حالؔی محبت، اخلاص، شرافت اور انسانیت کا پیکر تھے۔ یہی خوبیاں اُن کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

☆☆☆

نظیر نے اپنے کلام میں اخلاقی محاسن کو بڑی خوبی سے پیش کیا۔ اخلاقی شاعری میں ان کی نظم "بنجارا نامہ" قابل ذکر ہے۔ جس کو عوام و خواص میں شہرت حاصل ہے۔ نظیر نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی ہے اور نہ کسی کی تعریف میں قصیدہ یا نظم لکھی ہے۔

"بنجارہ نامہ"، "سفر آخرت"، "آدمی نامہ"، "پیٹ کی خلاصی"، "تن کا جھونپڑا"، "تندرستی کی فلاسفی"، "شب برات"، "عید"، "ہولی"، "راکھی"، "کرشن کنہیا" وغیرہ نظیر کی مشہور نظمیں ہیں۔ نظیر نے غزلیں بھی لکھی ہیں جو اپنے رنگ میں خوب ہیں۔

☆☆☆

اکائی ۱۶

حالی

حالات زندگی: خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص اور شمس العلماء خطاب تھا۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت کا بوجھ اُن کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ دستورِ زمانہ کے مطابق حالی کی ابتدائی تعلیم قرآن پاک سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد عربی اور فارسی کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ تعلیم کے شوق میں گھر چھوڑ کر دلی چلے گئے یہاں انھیں شاعروں اور ادیبوں کی صحبت کا فائدہ ملا۔ اس سے اُن کی ادبی اور علمی ذوق میں اضافہ ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں اُن کی مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی۔ جو ان کے لیے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ جس سے علمی و ادبی ترقی میں رکاوٹ آ گئی۔ لیکن وہ ہمت نہیں ہارے۔ ذوق شعر گوئی نے انہیں مرزا غالب کی خدمت میں پہنچایا جہاں انھیں غالب سے شعر و ادب میں بڑی رہنمائی حاصل ہوئی۔ فکر معاش میں حالی گھر سے نکلے۔ 1856ء میں حصار میں ملازمت مل گئی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد 1857ء کا غدر برپا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے انہیں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ 1857ء کے بعد حالی نواب مصطفےٰ خان شیفتہ رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے بحیثیت مصاحب وابستہ ہو گئے اور اُن کے لڑکوں کو بھی پڑھاتے رہے۔ یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ شیفتہ اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور شاعری میں اصلیت پر زور دیتے تھے۔ حالی نے اپنی صحبت سے بہت فیض اٹھایا۔ ان کی وفات کے بعد حالی لاہور چلے گئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں چار سال رہے اور انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرتے رہے اور درسی کتابوں کو درست کرتے رہے۔ یہاں مغربی ادب اور خیالات سے خوب واقف ہو گئے۔

حالی زیادہ دیر لاہور نہیں ٹھہر سکے اور دلی آ گئے۔ دلی میں ایک اسکول میں ملازم ہو گئے۔ یہاں حالی کی ملاقات

شعری آغاز اور ارتقاء کے سلسلہ میں کرنل ہالرائیڈ، محمد حسین آزاد اور حالی کے نام سرِفہرست ہیں۔ اور ان کی کوشش قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد کی 1874ء میں لاہور میں منعقد کی گئی محفلِ مشاعرہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کے بعد جدید نظم کو کافی فروغ ملا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شرر کے رسالہ "دلگداز" اور سر عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" نے جدید نظم کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ "مخزن" کے ممتاز نظم گو شعراء میں نظم طباطبائی، اقبال، خوشی محمد ناظر، تلوک چند محروم، مولانا ظفر علی خان، سرور جہان آبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

☆☆☆

اکائی: ۱۵

شامل نصاب نظم نگار شعرا کے حالات زندگی اور نظم نگاری

نظیر اکبر آبادی

حالاتِ زندگی: 1725ء میں پیدا ہوئے۔ وہ آگرہ اور اکبر آباد میں رہا کرتے تھے۔ تعلیم خانگی طور پر حاصل کی۔ بے فکر بہت تھے، اور ہر وقت اپنے جیسے بے فکروں کا ہجوم رہتا۔ کھیل کود، جوا، کبڈی، شطرنج، کنکوا بازی وغیرہ میں بڑے ہوشیار تھے۔ اور میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں بہت حصہ لیتے تھے۔ چونکہ وہ طبیعت بہت تیز اور خود بہت ذہین تھے۔ اس زمانے میں خوش نویسی کا چرچہ عام تھا۔ اس لیے نظیر نے بھی یہ فن سیکھ لیا۔ انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کے کلام کو دیکھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنجابی، بھاشا، پوربی اور مارواڑی بھاشا بھی جانتے تھے۔ آخری عمر میں فالج کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں 16 اگست 1830ء میں وفات پائی۔

طرزِ کلام: شاعر کیا تھے؟ چلتے پرزہ تھے۔ راہ چلتے شعر کہتے تھے۔ عام لوگ یہاں تک کہ فقیر اپنی صدا لگانے کے لیے ان سے شعر کہلواتے۔ چنانچہ نظیر کو عوام کی زبان اپنی شاعری میں استعمال کرنا پڑی اور اشعار ان کے جلد مقبول ہو گئے۔ لوگ ان کے کلام کو مبتذل اور سوقیانہ اور بازاری کہتے تھے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن ان سے کون انکار کرے گا کہ ان کے کلام میں اثر ہے۔ زندگی اور واقعات کی سچی تصویر کشی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلاتی ہے اور ہندوستان کے حالات کا آئینہ ہے۔ پُر لطف اور سبق آموز ہے۔

نظیر کے کلام کی اہم خصوصیات ان کی نیچرل شاعری ہے۔ موجودہ نیچرل شاعری ان ہی کی مرہونِ منت ہے۔ نظیر کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے خیالات خالص ہندوستانی تھے۔ اس لیے دیگر شعرا کے خلاف ان کے یہاں حب الوطنی کے جذبات زیادہ ہیں۔

اکائی: ۱۴

نظم کی تعریف، خصوصیات اور آغاز و ارتقاء

نظم کے معنی انتظام، ترتیب اور آرائش کے ہیں۔ لیکن عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے۔ اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں، جو ہیئت کے اعتبار سے نثر کے برعکس ہوں۔ اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام شاعری کو نظم کہتے ہیں۔ نظم کے لیے نہ ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چناں چہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظموں کے علاوہ آزاد و معریٰ نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہو سکتا ہے۔

عام طور پر نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے، جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہ ارتقا طویل نظموں میں واضح اور مختصر نظموں میں غیر واضح ہوتا ہے۔ اور ایک اکائی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

۱۔ پابند نظم: ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال، قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔

۲۔ نظم معریٰ: ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر ہوں، مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو، نظم معریٰ کہلاتی ہے۔ اسی کو نظم عاری بھی کہتے ہیں۔

۳۔ آزاد نظم: ایسی نظم جس میں نہ قافیے کی پابندی کی گئی ہو۔ اور نہ تمام مصرعوں کے ارکان برابر ہوں، آزاد نظم کہلاتی ہے۔

۴۔ نثری نظم: نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ردیف، قافیے اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔

اُردو نظم کی ابتدا و ارتقاء

اُردو شاعری میں نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھنا، جدید رجحانات کو شاعری کا جامہ پہنانا، داخلی کیفیت، خارجی واقعات، مناظر قدرت، فطرت، جذبات، تخیلات، واقعات، وطنیات، قومیات اور عصری میلانات کو نظم میں بیان کرنا نظم جدید کہلاتا ہے۔ جب زندگی اور زمانے نے کروٹ بدلی، ملک میں نئے حالات اور واقعات پیدا ہوئے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی میدان میں تیز تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح نظم جدید کا آغاز ہوا۔ تقریباً گزشتہ سو سال کا زمانہ نظم جدید کے فروغ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

موضوعی یا نفسِ خیال کے اعتبار سے نظم جدید اس نظم کو کہتے ہیں جس میں دورِ جدید زندگی کے مسائل، خیالات، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی گئی ہو۔ فنی ساخت کے اعتبار سے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی گئی ہو۔ اس کے بعد نظم جدید پر زور دیا گیا۔ فنی ساخت کے اعتبار سے نظم جدید اس نظم کو کہتے ہیں۔ جس میں شاعر نے شاعری کی قدیم اصناف میں بندھے ٹکے ضابطوں کا پابند نہ رہ کر نئی اور اچھوتی ہیئت میں اپنے تجربات کو ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہو۔ فنی ساخت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ایسی نظمیں جو نفسِ موضوع یا نظر کی تعمیری شعور کے اعتبار سے جدید ہیں، لیکن ہیئت کے اعتبار سے جن میں کسی روایتی صنف یا اسلوب نظم کی تقلید کی گئی ہو۔ مثنوی، قصیدہ، مسدس یا مخمس وغیرہ۔

۲۔ ایسی نظمیں جن میں مصرعوں، بندوں اور قوافی کی ترتیب کا ایک نیا اچھوتا التزام ہو۔ یعنی ہیئت کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ لیکن جن میں اوزان اور قوافی کے مروجہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو۔

۳۔ (ا) ایسی نظمیں جو صرف قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزاد ہیں۔ لیکن جن میں ابتدا سے آخر تک ہر مصرع میں وزن کے تقاضوں کی پوری پابندی کی گئی ہو۔ اس قسم کی نظموں کو نظم معریٰ کہا جاتا ہے۔

(ب) ایسی نظمیں جو وزن اور قافیہ کے روایتی ضابطوں سے یکسر آزاد ہیں۔ اس قسم کی آزاد نظموں کو نظم آزاد کہا گیا ہے۔

جدید نظم کے بانی نظیر اکبرآبادی تھے۔ ان کے کلام میں جدید نظم کی امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔ جدید نظم کی

تیسرا بند:

سنا ہے، ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت کا نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

تشریح: سنا ہے کہ ظلمت و نور یعنی تاریکی اور اُجالا الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب سنتے ہیں کہ منزل بھی مل چکی ہے۔ ظالموں کا اب طور بھی بدل چکا ہے۔ اب وصل کی مسرت حلال اور ہجر کی تکلیف حرام ہو گئی ہے۔ گویا وصال ہو چکا ہے۔ لیکن جگر کی آگ، دل کی سوزش کا ابھی تک علاج نہیں ہو پایا ہے۔

چوتھا بند:

جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا؟ کدھر کو گئی؟
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو! کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تشریح: ہم نے جدائی کا علاج کیا لیکن دل کی آگ کم نہیں ہوئی۔ نظر کی امنگ بھی ویسی ہی رہی۔ یہ نگارِ صبح کہاں سے آئی تھی اور کہاں چلی گئی ہے کہ ابھی سرِ راہ چراغوں کو بھی ان کی کچھ خبر نہیں ہے اور رات کی گرانی میں کمی آئی ہے۔ اس لیے یہ وہ صبح نہیں جس کا ہمیں انتظار تھا۔ کیوں کہ ابھی عام لوگوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ چند ہاتھوں میں کچھ آ گیا ہے یا چند چہرے بدل جانے کو مکمل آزادی نہیں کہتے۔ اس کے لیے ابھی جد و جہد کرنی ہے۔ اس لیے اے دوستو ابھی اپنی کوششیں جاری رکھو کہ وہ منزل جس کی ہمیں آرزو تھی نہیں آئی ہے۔

مشق کے لیے:

۱۔ ''نثار میں تیری گلیوں پہ'' میں فیض نے کیا کہنے کی کوشش کی ہے؟
۲۔ فیض کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انھیں بیشتر دوسرے ترقی پسند شعراء سے الگ کرتی ہے؟
۳۔ ''صبح آزادی'' کی روشنی میں فیض کی شاعری پر بحث کیجیے۔
۴۔ مشکل الفاظ کے معنی لغت میں دیکھیے۔

☆☆☆

سنا ہے، ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا؟ کدھر کو گئی؟
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو! کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تمہید: "صبح آزادی" فیض کی آزادی کے بعد کی نظم ہے۔ اس نظم میں فیض احمد فیض نے یہ بتایا ہے کہ بے شک ہمیں آزادی مل چکی ہے لیکن ابھی ہم سماجی اور معاشی اعتبار سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایسی آزادی ہے کہ ظالم تو چلے گئے ہیں لیکن ہم اسی پرانے نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ گویا یہ آزادی مکمل آزادی نہیں ہے۔ لہٰذا ابھی وہ گھڑی نہیں آئی کہ ہم چین سے بیٹھ جائیں۔ ابھی جدوجہد جاری رکھنا ہوگا۔

پہلا بند:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار، کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

تشریح: اس بند میں فیض کہتے ہیں کہ آزادی کی صبح کا اُجالا داغ داغ ہے بلکہ یہ صبح رات کی کاٹی ہوئی ہے۔ یہ وہ صبح نہیں جس کا ہمیں مدتوں سے انتظار تھا۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ یہ وہ صبح نہیں ہے جس کی آرزو لے کر ہم نے لاکھوں مصیبتیں جھیلیں تھیں۔ یہ وہ صبح نہیں ہے جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی تھی اور یہ چاہا تھا کہ ہم سب کچھ کھو کر بھی اس کو پائیں گے۔

دوسرا بند:

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے؟
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

تشریح: اس آسمان کے ستاروں کی کہیں تو کوئی آخر منزل بھی ہوگی۔ شب کی اس سست موج کا کہیں ساحل بھی ہوگا۔ اس دُکھی دل کی کشتی بھی تو کہیں رُکے گی، کنارے لگے گی۔ خون کے ان پُر پیچ راستوں پر جو جوان نکلے تو اُنھوں نے اپنی جان کو قربان کر دیا۔ کتنی ہی باہیں، کتنے ہی بدن اُن کو پکارتے رہے۔ لیکن وہ آگے بڑھتے رہے کیوں کہ اُن کو اپنے وطن کی صبح آزادی بہت عزیز تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے حسینوں کا دامن بہت قریب ہونے کے باوجود جھٹک دیا اور آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھ گئے۔

رات کا سویرا ہوگا اور ہمیں اپنی منزل کا نشان ملے گا۔

تیسرا بند۔ شاعر کہتا ہے کہ روزنِ زنداں سے جو روشنی آنا بند ہوگئی تو ہم نے یعنی تیرے چاہنے والوں نے یہ سمجھا کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہے یعنی رات ہوگئی ہے اور جب ہمارے پاؤں کی بیڑیاں چھنکنے لگیں تو ہمارے دلوں نے یہ خیال کیا تیرے رُخ پر صبح کی کرنیں بکھر گئی ہوں گی۔ یعنی صبح ہوگئی ہے۔ اس طرح غرض ہم اپنی شام و سحر کو سایۂ دیوار کی گرفت میں گزار رہے ہیں۔ اس بند میں شاعر نے شب کے لیے ستاروں سے مانگ اور صبح کے لیے رُخ پر سحر کے بکھرنے کے استعمال سے لاثانی حُسن پیدا کردیا۔

چوتھا بند۔ اس بند میں شاعر قاعدہ کھینچتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ ظالموں کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کو قید و بند سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ ظلم سہتے ہیں اور آخرکار ظالموں کی ہار اور ان لوگوں کی جیت ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی رسم نہیں بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ لہٰذا اے میرے ہم وطن اس سبب سے ہم زمانے سے گلہ نہیں کرتے اور نہ تیری جدائی میں ہم دل ہی میلا کرتے ہیں۔

پانچواں بند۔ چونکہ ہر شب کے بعد صبح کا اُجالا ہوتا ہے اس لیے اے میرے ہم وطن آج اگر ہم تجھ سے جدا ہیں تو کل ضرور ملیں گے کہ تھوڑے دنوں کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آج اگر ظالموں کا ستارہ طاقتور ہے تو کیا ہوا۔ یہ صرف چار دن کی جدائی ہے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اب وقت بہت قریب ہے کہ ہم تم ہم ایک ساتھ ہوں گے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جو تجھ سے تعلق خاطر رکھتے ہیں وہ شب و روز کی گردش کا علاج جانتے ہیں۔ گویا جو تجھ پر قربان ہونا جانتے ہیں ان کے لیے ناساز گار حالات کوئی معنی نہیں رکھتے۔

☆☆☆

اکائی:۱۳

فیض احمد فیض

صُبحِ آزادی

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار، کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے؟
دیار حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

اِکائی:12

فیض احمد فیض

نظم "نثار میں تیری گلیوں پہ"

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں ‌ ‌ ‌ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے ‌ ‌ ‌ نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے ‌ ‌ ‌ جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی ‌ ‌ ‌ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے ‌ ‌ ‌ کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے ‌ ‌ ‌ کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے ‌ ‌ ‌ یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا ‌ ‌ ‌ یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

تمہید: فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر تھے لیکن وہ دوسرے ترقی پسند شعراء سے اس لیے ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے تھے کہ ان کے کلام میں وہ گھن گرج نہیں ہے اور تلخی نہیں ہے جو دوسروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے ہاں وطن کی آزادی کی تڑپ اور اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ مایوسی کا شکار نہیں ہیں بلکہ ان کے نزدیک آزادی کا سورج بالآخر ضرور طلوع ہوگا۔ یہی ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

یہ نظم وطن کی آزادی کے سلسلے میں ان کی چنندہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ محبوب کو سمجھاتے ہیں کہ تیرے فراق میں ہم اس لیے برا نہیں مناتے کیوں کہ ایک دن خوشیاں ہمارے قدم چومیں گی۔

پہلا بند: اے وطن میں تمہاری گلیوں اور کوچوں پر قربان جاؤں۔ یہاں یہ رسم رواج پا چکی ہے کہ کوئی شخص جو تیرا چاہنے والا ہے، سر اٹھا کر نہ چلے اور اگر کوئی تمہارا چاہنے والا تیرا طواف کرنا چاہے یا تیرے طواف کو نکلے تو وہ زمانے اور حالات سے نظریں چرا کے اور بہت احتیاط سے نکلے

گویا کہ اب یہاں ایسا انتظام ہے کہ تیرے ہر چاہنے والے کو قید کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اینٹ پتھر تک قید کر دیے گئے ہیں۔ اب اگر کوئی آزاد ہے تو وہ صرف حکومت کے خیر خواہ ہیں۔ شاعر انھیں حکومت کے پٹھو کہتا ہے۔

دوسرا بند: اے وطن تیرے چاہنے والوں پر یہاں ظلم کرنے کے لیے معمولی سا بہانہ ہی کافی ہے۔ اس لیے جو کچھ ایک جنوں کی حد تک تیرے چاہنے والے ہیں، تیرے نام لیوا ہیں ان پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ یہاں انصاف مفقود ہے کیوں کہ جن اہلِ ہوس ظالم بھی ہیں اور منصف بھی۔ لہٰذا کسی کو وہ انصاف کیسے دے سکتے ہیں اور ان حالات میں کون ہماری وکالت کرے اور کس سے فریاد کی جا سکتی ہے۔ مگر تیرے عاشق تیرے فراق میں صبح و شام گزار رہے ہیں کہ کبھی تو اس

اکائی: 11

محمد اقبال

نظم "نیا شوالہ"

۱۔ سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے تو میں سچ کہہ دوں کہ تیرے بت کدوں کے بت پرانے ہو گئے ہیں۔ اور اب اُن بتوں کی پوجا کرنے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ان بتوں نے تجھ کو اپنوں کے ساتھ دشمنی کرنا سکھا دیا ہے۔ (یہاں ہندو مسلم اختلافات اور لڑائی جھگڑے کی طرف اشارہ ہے)۔ برہمن اور مسلمان واعظین کی اس ذہنیت کو دیکھ کر مجھے آخر کار مندر اور مسجد کو چھوڑ دینا پڑا۔ اور میں نے شیخ و برہمن دونوں سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ شیخ و برہمن کی حیثیت باغِ مذہب میں ایک مالی کی سی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں اور نہ فکر ہے۔ دراصل اُن کے اختلافات ہی نے ملک کی فضا کو زہر آلود بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے قوم کے افراد تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

اے برہمن! تو یہ سمجھتا ہے کہ پتھر کی مورتیوں میں خدا پوشیدہ ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وطن کی سرزمین کا ہر ذرہ ایک دیوتا ہے جس کی پرستش اور پوجا ہم پر لازم ہے۔ یعنی وطن اور قوم سے پوری محبت اور ہمدردی ہمارے لیے ضروری ہے۔ وطن اور قوم سے بڑھ کر کوئی چیز اہم اور ضروری نہیں ہے۔

۲۔ آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے، مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
شکتی بھی شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ اے برہمن! آ تا کہ ہم مل کر ایک بار پھر بیگانگی اور اختلافات کے پردوں کو اٹھا دیں۔ اور ہندو مسلم اختلافات کو دور کر کے سب کو ایک دوسرے کے قریب کر دیں۔ ہمارے دلوں کی دنیا ایک مدت سے ویران ہو چکی ہے اور سنسان پڑی ہوئی ہے۔ آ ہم اس دنیا میں یعنی دل میں محبت کا ایک نیا مندر قائم کر دیں۔ جس کا تیرتھ دنیا کے تمام تیرتھوں سے بڑھ کر اونچا ہو۔ اور جس کا کلس (کلغی۔ مینار) آسمان سے باتیں کرتا ہو۔ پھر اس بت کدہ میں شان پیدا کر دیں۔

اے برہمن! ہمیں چاہیے کہ ہم روزانہ صبح اٹھ کر ایسے میٹھے منتر پڑھیں جن سے سارے پجاریوں کو محبت اور پریم کی شراب کے نشہ کا لطف آ جائے۔ جب عوام کو مندر میں بلانا مقصود ہو تو اذان کی آواز کو ناقوس میں چھپا دیں۔ یعنی تمام ہندوستانی قوم کو ایک مرکز پر لانے کے لیے مذہبی اختلافات دور کر دیں۔ جو وطن کے شیدائی اور عاشق ہیں اُن ہی کی آواز میں طاقت بھی ہے اور امن و سکون کا پیغام بھی ہے۔ اس سرزمین پر رہنے والوں کی نجات، پیار و محبت اور یکجہتی میں ہے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

☆☆☆

دکھائی دے رہا ہو۔ وہاں کے پہاڑوں کا منظر بھی عجیب دلکش ہو وہ اتنے خوبصورت ہوں جیسے ندی کا پانی لہریں بن کر اُٹھ کر دیکھ رہا ہو۔ یعنی پہاڑ کے دل فریب منظر کا نظارہ کر رہا ہو۔

اشعار ۱۱ تا ۱۵

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو — سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے — جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

تشریح: شاعر فرماتا ہے کہ زمین کے دامن میں مخمل جیسا سبزہ سویا ہوا ہو اور جھاڑیوں کے آس پاس صاف و شفاف پانی چمک رہا ہو۔ یا قوس میں جھاڑیوں پر کھلے پھول اور پھول والی ٹہنیاں اس پانی کو چھو رہی ہوں اور ایسے دکھ رہا ہو معلوم ہو جیسے کوئی حسین آئینے میں اپنی تصویر دیکھ رہا ہو۔ جب سورج شام کی دلہن کو مہندی لگائے یعنی شام ہو اور آسمان پر شفق کا رنگ نمایاں ہو اس وقت شفق کی سرخی کے سبب ہر پھول سنہرے لباس میں ملبوس نظر آئے۔ شاعر کہتا ہے اندھیری رات تو چلنے والے مسافر جب تک تھک کر ہمت ہار بیٹھے ہوں ان کا حوصلہ ٹوٹ چکا ہو اس وقت میرے گھر کا ٹوٹا ہوا دیا ان کی امید بن جائے اور وہ اپنے راہ پر چلنے کے لئے نئے عزم کے ساتھ تیار ہو جائیں۔ جب آسمان پر ہر سو بادل گھرے ہوئے ہوں اور کوئی جائے پناہ نہ ملے تو اس وقت بجلی کے چمکنے پر ان کو میرا کٹیا نظر آ جائے تاکہ ان کے حوصلے پھر سے تازہ دم ہو جائیں۔

اشعار ۱۶ تا ۲۰

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن — میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا، مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو مری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے — بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ رات کے پچھلے پہر جب کوئل اپنا نغمہ چھیڑے میں اس کو سن کر جاگ جاؤں ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم نوا ہو جائیں اور اس کی آواز سن کر میں یاد الٰہی میں مشغول ہو جاؤں۔ مندر اور مسجد کا میرے کانوں پر کوئی احسان نہ ہو یعنی مندر کی گھنٹی اور مسجد کی اذان میرے لئے سحر خیزی کا پیغام نہ لائے بلکہ مجھے میری جھونپڑی کے روزن سے ہی اندازہ ہو جائے کہ صبح ہونے والی ہے۔ شاعر کہتا ہے جس وقت شبنم پھولوں پر گر کر انھیں تر و تازہ بنانے کا کام کر رہی ہو اس وقت میرا دل قوم کے غم میں آنسو بہا رہا ہو اور میری فریاد دعا بن کر آسمان کی طرف جا رہی ہو۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ صبح کی اس خاموشی میں میرے نالے اتنے بلند ہو جائیں کہ وہ آسمان کے تاروں کے قافلے کے لئے روانگی کی صدا بن جائیں اور جو بے ہوش اور بے خبر پڑے ہیں انھیں جگانے کا کام کریں۔ اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور اپنی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھائیں۔

☆☆☆

اکائی: ۱۰

محمد اقبال

نظم "ایک آرزو"

تعارف: "ایک آرزو" محمد اقبال کی ایک نظم ہے۔ اقبال ہماری زبان کے فلسفی شاعر ہیں انھیں شاعرِ مشرق بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ان کے درد کی دعا کرنے کی سعی کی ہے۔ ایک آرزو میں انھوں نے اپنی خواہشات اور ارمانوں کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں اس دنیا کے ہنگاموں، چہل پہل اور شور و غل سے تنگ آچکا ہوں لہٰذا میں فطرت کے آغوش میں چند لمحات گزار کر قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ غرض اقبال نے نظم ایک آرزو کے ذریعے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور جب ان کی آواز اور پکار سن کر وہ نہیں جاگے تو انھوں نے تنہائی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس نظم اقبال نے بڑے موثر انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ نظم ایک آرزو جہاں ایک طرف اقبال کے فن اور انداز کی آئینہ دار ہے وہیں دوسری جانب ان کی خواہشات اور احساسات کا حسین مرقع۔

"ایک آرزو" کی تشریح

اشعار ۱ تا ۵:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ دنیا کی رونقوں اور ہنگاموں سے میں تنگ آچکا ہوں دنیا کی محفلوں سے میرا دل بھر چکا ہے چونکہ میرے دل میں کوئی آرزو باقی نہیں رہی ہے لہٰذا اس دنیا میں رہنے کا مجھے کوئی لطف نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اس دنیا کے شور و غل سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ میرا دل کسی ایسی جگہ کی تلاش میں ہے جہاں کوئی شور و غل نہ ہو مکمل سکوت ہو۔ شاعر کہتا ہے مجھے خاموشی پسند ہے اور میں اسی پہ مرتا ہوں میری خواہش ہے کہ میں دنیا سے دور کسی پہاڑ پر جا کر ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر رہوں۔ جہاں میں دنیا کی فکر اور دنیا کے مسائل سے آزاد ہو کر رہوں اور دنیا کا کوئی غم میرا پیچھا نہ کرے۔ میں دنیا کے غموں سے دور ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں پرندوں کے نغمے اور چشموں کا پانی ایک سرودگی کی کیفیت پیدا کر رہا ہو۔

اشعار ۶ تا ۱۰

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل — ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ میرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ پھول کی کلی کھل کر خدا کی قدرت کا پیغام دے اور اس چھوٹے سے پیالے میں یعنی کلی میں مجھے جامِ جمشید کی طرح پوری دنیا اور قدرت کا تمام نظارے دکھائی دیں۔ آرام فرمانے کی خاطر ہاتھ کا سرہانا اور سبز گھاس کا بچھونا ہو جس مقام پر میرا رہن سہن ہو وہاں ایسی خلوت یعنی تنہائی ہو جسے دیکھ کر محفلوں کی رونق بھی ماند پڑ جائے۔ باغ کے بلبل میری صورت سے بہت مانوس ہو اور اس کے ننھے سے دل میں میرا کوئی ڈر نہ ہو۔ وہ ایسا مقام ہو جہاں ندی کے کنارے کنارے ہرے ہرے پیڑ پودے قطاروں میں کھڑے ہوں اور اس کا عکس پانی کے بیچ

پھر یہ کہا کہ میں نے سُنی سب یہ داستان | لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان | بچے ہو، اس کا علم نہیں تم ہو بے گمان

اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ ممتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

تشریح: جب ماں نے شری رام کی باتیں سُنی تو کہا بیٹا اگرچہ تمھاری لاکھوں برس کی عمر ہو، ماں کو علم سکھا رہے ہو لیکن اس وقت جو میرے دل کو امتحان درپیش ہے اس کا بے شک تم کو علم ہی نہیں ہے کیوں کہ تم ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے۔ ابھی بچے ہو۔ میرے درد کا شریک تمھارا دل نہیں ہو سکتا کیوں کہ ممتا کی تڑپ کیا ہوتی ہے اس کا تم کو ابھی علم نہیں ہے۔

پچیسواں بند:

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں | باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں | جاؤ سدھارو! خوش رہو میں روکتی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

تشریح: تمھیں ابھی ان آنسوؤں کی قدر نہیں۔ یہ وہ دل کی آگ ہے جو گیان کی باتوں سے بجھنے کی نہیں۔ تم جاؤ بن کو سدھارو اور تم خوش رہو، میں تمھیں نہیں روکتی۔ میں دنیا میں بے شرمی سے زندہ رہوں گی۔ تم کو جنم دیا ہے پالا پوسا ہے تو یہ دکھ بھی سہہ لوں گی۔

چھبیسواں بند:

نشتر تھے رام کے لیے یہ حرفِ آرزو | دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو | سُننی پڑی اسے یہ قیامت کی گفتگو

کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں میں ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے

تشریح: ماں کے یہ دل خراش الفاظ شری رام چندر جی کے لیے نشتر کی مانند تھے۔ تیروں کی طرح تھے۔ گویا بن کر ان کا

دل ہل گیا اور جسم سے جیسے لہو سرکنے لگا۔ سکت باقی نہ رہی۔ وہ رام جو ماں کے ایمان کو اپنا ایمان و آبرو سمجھتا ہو اسے یہ قیامت کی گفتگو سُننی پڑی۔ فکر و غور کرنے کے بعد بھی کوئی جواب اس سے بن نہیں پایا تو وہ ماں کے قدموں پر گر پڑا۔ ایسے گرا جیسے آنکھوں سے آنسو گرتا ہے۔

ستائیسواں بند:

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا تھا بند | رک رک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہنچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند | مرنا مجھے قبول ہے، جینا نہیں پسند

جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لیے
دوزخ ہے زندگی ہے اس اولاد کے لیے

تشریح: اس کے آنسوؤں کے طوفان کو اس کی زبان والی روک تھمی کی ہچکی بند ہو گئی۔ لہٰذا رک رک کر وہ دردمند یوں مخاطب ہوا کہ اے ماں اگر آپ کے دل کو مجھ سے صدمہ پہنچا ہے تو مجھے مرنا منظور ہے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ جو اپنی ماں کا وفادار نہیں ہے اس اولاد کے لیے زندگی جہنم ہے۔

مشق کے لیے:

۱۔ "رامائن کا ایک سین" کے باقی بچے بندوں کی تشریح کیجیے۔
۲۔ "رامائن کا ایک سین" کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
۳۔ مشکل الفاظ کے مطالب لغت میں دیکھیے۔
۴۔ باقی بچے بندوں کی خود تشریح کیجیے۔

بیسواں بند:

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں — ہے دن کی دھوپ، رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں — وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

تشریح: باغبان پھولوں سے اکثر محبت کرتے ہیں۔ دن کی دھوپ اور رات کی شبنم سے انھیں بچاتے ہیں۔ لیکن اچانک جو باغ کا رنگ بدلتا ہے۔ ہزار پردوں کے باوجود وہ گل ختم ہو جاتے ہیں جو باغبان انھیں اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ وہ خزاں کے پتوں کی طرح مایوسی کے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

اکیسواں بند:

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار — موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار — وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

تشریح: لیکن دوسری طرف صحرا/جنگل میں جو بے شمار قدرتی پھول کھلتے ہیں وہ بہار کی، ریاض پر منحصر نہیں ہیں۔ خدا کی چمن بندی کی قدرت دیکھو کہ وہ ہوا، بارش، برف میں قائم رہتے ہیں۔ ان پر جو کرم کرنے والے رب کی مہربانی ہوتی ہے تو زہریلی ہوا کی موج بھی ان کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن جاتی ہے۔

بائیسواں بند:

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر — صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر — رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت، دامن مادر سے کم نہیں

تشریح: خدا کے کرم پر اپنی نگاہ رکھیں۔ وہ اگر مہربان ہے تو جنگل بھی گلشن بن جائے گا۔ پھر جنگل ہو، ویرانہ ہو، پہاڑ ہو کہ سفر ہو، ایک جگہ قیام ہو، وہ اپنے بندے کے حال سے کبھی بے خبر نہیں رہتا۔ اگر اس کا کرم شریک حال ہے تو جنگل کا دامن بھی ماں کے دامن سے کم نہیں ہے۔

تئیسواں بند:

یہ گفتگو ذرا سے ہوئی ماں پہ کارگر — جس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر — جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر

چھپا جو بے کسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں پہ آ گئی

تشریح: رام چندر جی کی اس گفتگو نے جو ماں پر اثر کیا۔ مایوسی کی شدت میں ہنس کر انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ چہرے پہ اس طرح ہنسی کا اثر ظاہر ہوا جس طرح شمشان میں چاندنی کا منظر ہوتا ہے۔ جو بے کسی اندر پوشیدہ تھی وہ چہرے پر جھلک گئی۔ جو دل کی مردہ حالت تھی وہ آنکھوں سے عیاں ہو گئی۔

چوبیسواں بند:

آخر ہے عمر، ہے یہ میرا وقت واپسیں — کیا اعتبار؟ آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس دل کو ہے یقیں — سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادر حزیں؟

اولاد جب کبھی تمھیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

تشریح: اب میں زندگی کے آخری حصے میں ہوں۔ یہ میرا عدم واپسی کا وقت ہے۔ میرا کیا بھروسا آج ہوں کل ممکن ہے نہ ہوں لیکن میرے اس دل کو یقین ہے کہ ایک دن وہ وقت بھی آئے گا جب تم سوچو گے کہ غم زدہ ماں کیوں روتی تڑپتی تھی۔ جب تمھارے بھی اولاد ہو گی تب تمھیں اس غریب ماں کی فریاد یاد آئے گی۔

چودھواں بند:

دیکھے ہیں اس نے بڑھ کے زمانے نے انقلاب — جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب

سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب — بچپن مٹی کسی کی، کسی کا مٹا شباب

کچھ بن کھلے مرجھا گئے

کچھ بن کھلے پڑا جو نصیبے بگڑ گئے

وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

تشریح: دُنیا نے اس سے کہیں زیادہ بڑے انقلاب دیکھے ہیں۔ ایسے انقلاب کہ جن سے منہ جاتے کتنے ہی بے گناہوں کی عمریں خراب ہو گئیں۔ اندر کے درد سے دل جگر بھن گئے۔ کوئی بڑھاپے میں چل بسا تو کوئی عالم جوانی میں ہی رحلت کر گیا۔ جب مقدر بگڑ گئے تو پھر کسی کا زور نہیں چلا اور ایسی مصیبتیں آئیں کہ بھرے پُرے گھر اُجڑ گئے۔

سولھواں بند:

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی — قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی

دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی — ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے

اُن کو جلا کر خاک کیا اپنے ہاتھ سے

تشریح: ایسے ایسے عزیز کہ ماں باپ کی نگاہیں جن کے چہروں سے ہٹتی نہیں تھیں اور جن کی زندگی سے اُن کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں۔ جن پر کبھی ماں باپ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ کبھی ان کے جسم کی گرد بھی اُن کے دامن کو نہیں چھو پائی تھی۔ جن کو کبھی انھوں نے خواب میں بھی پھولوں کی سی نازک چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ جب وہی اس زندگی سے محروم ہو گئے تو انھی ماں باپ نے اپنے ہاتھوں سے اُن کو جلا کر راکھ کیا۔

سترھواں بند:

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال — اِن بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال

ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال — خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا

آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا؟

تشریح: اُن بوڑھے ماں باپ کا غم دیکھ کر لوگ یہی کہتے تھے کہ اِن کا زندہ رہنا اب ممکن نہیں ہے۔ خدا کی شان دیکھو کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو دھیرے دھیرے اُن کے دل سے جدائی کے درد کا احساس جاتا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ روز پیٹے۔ ماتم کرتے رہے اور آخر رو دھو کے چپ چاپ بیٹھ گئے اور تو کچھ اُن سے نہیں ہو سکا۔

اٹھارواں بند:

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار — کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار

مایوس ہو کے ہوتے ہیں انسان گناہگار — یہ جانتے نہیں، وہ ہے دانائے روزگار

انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے

گردن وہی ہے، امرِ رضا میں جو خم رہے

تشریح: جس غریب پر دکھ درد کا پہاڑ ٹوٹتا ہے اُس کو آسمانی اختیار سے صبر وہ اوپر والا عطا کرتا ہے۔ اُس کی رحمتوں سے مایوس ہو کر انسان گناہگار ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پروردگار سب کچھ جانتا ہے۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ خدا کی راہ میں ثابت قدمی سے آگے بڑھتا رہے اور اُس کی رضا میں جو گردن خم رہتی ہے وہی گردن دراصل گردن ہے۔

انیسواں بند:

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام — بعد سفرِ وطن میں ہم آئیں گے شاد کام

ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام — قائم اُمید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں

کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

تشریح: اور آپ کے لیے تو دُکھ کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ ہم بن باس کے بعد خوش و خرم لوٹیں گے۔ چودہ برس کا عرصہ ہی کتنا ہوتا ہے، بات کرتے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کہ دُنیا اُمید ہی سے قائم ہے اور ویسے بھی رنج و مصیبت سے کون جگہ خالی ہے۔ دو پل میں کیا ہو جائے کون جانتا ہے۔

دسواں بند:

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا خطا　　　مجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ　　　اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آساں مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

تشریح: خدا جانے مجھ سے ایسے کون سے گناہ ہو گئے تھے جو اس طرح بیچ بھنور کے میری زندگی کی کشتی تباہ ہو گئی ہے۔ آرام و سکون کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی ہے۔ لہٰذا اب موت آ جائے اور دوسری دنیا میں جگہ ملے تو بہتر ہے۔ اللہ میری خطا، میری بھول چوک کو معاف کر دے اور موت میری یہ مشکل آسان کر دے تو بہتر ہے۔

گیارھواں بند:

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز　　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

تشریح: ماں کی یہ دردانگیز فریاد سن کر اس خستہ جان کے دل پر غم کی چھریاں چلنے لگیں۔ اس وقت جو اس کے دل کی حالت تھی کہ وہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ عین ممکن تھا کہ آنکھیں اس وقت بھر آتیں لیکن اس نے ضبط کیا اور یہ سوچا کہ رونے سے گریز کیا کہ یہ بے کس کہیں ایسا نہ ہو ہم کو ناشاد دیکھ کر جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بارھواں بند:

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور　　　مایوس کیوں ہیں آپ؟ الم کا ہے کیوں وفور؟
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور　　　لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکلِ عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

تشریح: پھر اس نے اپنی ناشاد ماں کے حضور میں عرض کیا کہ آپ اس قدر کیوں مایوس ہیں۔ آپ اس قدر غمگین کیوں ہیں۔ بڑھاپے میں یہ صدمہ مشکل ضرور ہے لیکن آپ صبر و قرار کو دل سے جانے مت دیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد پھر اچھے دن آ جائیں۔ خزاں کے بعد پھر بہار آ جائے اور ہو سکتا ہے پروردگار کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔

تیرھواں بند:

یہ جعل، یہ فریب، یہ سازش، یہ شور و شر　　　ہوتا ہے جو یہ سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر　　　کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر؟
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

تشریح: یہ دھوکہ، یہ فریب، یہ سازشیں، یہ ہنگامے محض بہانے ہیں۔ کرنے والا تو کوئی اور ہے۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں، ان کو خاطر میں نہ لائیں۔ قدرت کے پردے میں کیا کیا رنگ جلوہ گر ہیں کون جانتا ہے۔ اس کی مصلحت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ کیا کرنے جا رہا ہے، اسے کیا منظور ہے کوئی نہیں جانتا۔

چودھواں بند:

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار　　　واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار　　　ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

تشریح: آرام ہو یا دکھ ہو یا خوشی ہو یا پریشانی ہو مناسب یہی ہے کہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ زمانے کے ہاتھوں ستم اٹھائے ہوئے صرف آپ ہی نہیں ہیں بلکہ دنیا کے اس ماتم کدے میں لاکھوں سوگوار ہیں۔ کیا کسی پر مشکل نہیں پڑی؟ کیا کسی نے مشکل نہیں اٹھائی؟ دنیا میں صرف ہمیں ہی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے بلکہ مشکل بہتوں پر پڑی ہے۔

چھٹا بند:

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید؟ | اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید | سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

کھیلی ہے کیا حیاتِ ابد؟ ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کن دن کے واسطے؟

تشریح: یہ دنیا میں کیسی بے ایمانی آ گئی ہے کہ ہر کسی کو مال و دولت کی خواہش نے اندھا کر دیا ہے۔ آخر انجام کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔ اور اگر انسان اس انجام کو سوچے تو وہ بید کے مانند کانپ اُٹھے۔ جو لوگ اس کے جال پھیلا رہے ہیں کیا انھیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ کیا انھیں موت ایک دن اپنا نوالہ نہیں بنائے گی۔

ساتواں بند:

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم | ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
استادہ سائبان کے مجھے شوکت و حشم | تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں، پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

تشریح: میں نے اگر کسی مفلس فقیر کے گھر جنم لیا ہوتا تو ان سب مصیبتوں کے سامان اکٹھے نہیں ہوتے۔ یہ بادشاہت کی شان و شوکت کا سائبان مجھے ہرگز نہ وحشت دیتا۔ تم جیسے میرے بیٹے تھے اس سے بڑھ کر کیا کوئی سلطنت ہو سکتی ہے۔ کوئی اس تاج و تخت کو پھونک دے، مجھے رتی بھر دکھ نہیں ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔ تمہاری موجودگی میرے لیے سلطنت ہے۔ جب تم ہی پاس نہیں ہو گے تو میں اس راج کا کیا کروں گی۔

آٹھواں بند:

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال | دیکھی تمھاری شکل جب میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال | آفت یہ آئی مجھ پہ جب ہوئے سفید بال

پوچھتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

تشریح: ہم نے نہ جانے کیسی کیسی مشقتوں سے سال مہینے گزارے ہیں تب جا کر اے میرے لال تمہاری شکل ہم نے دیکھی ہے گویا تمہیں پایا ہے۔ اور جب تمہیں پایا ہے تب کہیں جا کر تمہارے بیاہ کا سب سے بڑا ارمان پورا ہوا۔ اب جب میں بوڑھی ہو گئی ہوں، بال سفید ہو گئے ہیں تو تمہاری جدائی کی یہ مصیبت مجھ پر نازل ہوئی ہے۔ بہر حال جن کے لیے ترکِ دنیا کیا ان سے پوچھتی ہوں، کیا میری ریاضت کا یہی صلہ تھا۔ یہی دن دیکھنے کے لیے وہ سب میں نے کیا تھا۔

نواں بند:

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر | گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر | یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

تشریح: دنیا میں ایسے نامراد لوگ بھی بہت ہیں جو عمر بھر بے اولاد رہے۔ اگر میرے گھر بھی اولاد نہ ہوتی تو میں یہ سوچ کر کہ میری دعائیں بے اثر ہیں صبر کر لیتی۔ مگر میرا مقدر تو سنور کے بگڑ گیا ہے۔ میری تمنا کا باغ پھل پھول سب دے کے اجڑ گیا ہے۔ میں سب پا کر کھو رہی ہوں۔

دوسرا بند:

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

تشریح: وہ نونہال، وہ بچہ دل کو بہ مشکل سنبھالتا ہوا ماں کے پاس گیا اور ایسے خاموش کھڑا ہو گیا جیسے کوئی خیالی صورت ہو۔ اس نے دیکھا کہ وہ بدحال ماں ایک دروازے پر بیٹھی ہے اور غم کی شدت سے وہ بے حرکت و بے حس ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے جسم میں لہو باقی نہیں رہا ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا ہے اور وہ ایسی بے حرکت و بے حس ہو گئی تھی کہ جیسے وہ کوئی انسان نہیں پتھر کی مورت ہو۔

تیسرا بند:

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

تشریح: وہ بے گناہ نہ جانے کس خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے آنکھوں کے نور، اپنے کلیجے کے ٹکڑے شری رام چندر جی جو وہاں کھڑے تھے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ذرا سے لب ہلے اور اس نے ایک سرد آہ بھری۔ دیکھتے میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ چہرے کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ دل کی حالت کیا ہے۔ جسم کا ایک ایک بال اس کی حالتِ زار کو بیان کر رہا تھا۔

چوتھا بند:

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

تشریح: آخر مایوسی کی قید میں جکڑی ہوئی ماں کے دہن کا قفل ٹوٹا، مصائب کی شدت کا اظہار ہوا۔ مصیبت کیا آسمان کے ظلموں کا ایک دفتر تھا، وا ہو رہا تھا۔ بات کرنے کے لیے لب کیا کھلے تھے کہ منہ کا گویا زخم کھل گیا تھا۔ اس غریب نے جو اپنے دردِ دل کو بیان کرنا شروع کیا تو شدتِ درد سے اس کا کلیجہ پھٹ گیا اور اس کی باتوں سے خونِ جگر کا رنگ صاف دکھائی دینے لگا۔

پانچواں بند:

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں!
میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں؟
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں؟

تشریح: ماں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شری رام چندر جی سے کہا کہ اے میرے لاڈلے یہاں خاموش کیوں کھڑے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم یہاں میرے پاس کس لیے آئے ہو۔ اگر سب لوگ اس میں خوش ہیں تو جنگل کو چلے جاؤ۔ لیکن میں تمہاری ماں ہوں۔ میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ لہٰذا میں ہرگز اپنی زبان سے اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں اپنی آنکھوں کے تارے اپنے عزیز بیٹے کو کس طرح بھیج دوں، میں وہ کلیجہ کہاں سے لاؤں کہ اپنے راج دلارے کو جوگی بنا کے جنگل کو روانہ کر دوں۔

ہے دور اس غلام سے خود رائی کا خیال / ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال / جو دین آپ کا ہے، ادا ہو یہ ہے محال
جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدے نے باپ کے

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ / لیکن بہار عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ / ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل میں لگے گا داغ
بے آبرو یہ جسم نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں / کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سنوں گا میں / دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہوں گا میں!
”لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا؟ باپ کا کہنا نہیں کیا“

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب / خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے مٹ گئی تیزی عتاب / چھاتی بھر آئی، ضبط کی باقی رہی نہ تاب
سرکا کے پاؤں، گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوئے اور بی اماں / گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں؟ / ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دشرتھ کے راج میں

☆☆☆

نظم ”رامائن کا ایک سین“ کی تشریح

تعارف: نظم رامائن کا ایک سین چکبست کی ایک شاہکار نظم ہے۔ اس میں چکبست نے شری رام چندر اور ان کی ماں کی اس وقت کی گفتگو اور مکالموں کو نظم کیا ہے جب شری رام چندر جی اپنے والد کا وعدہ، جو انھوں نے اپنی ایک رانی کیکئی کے ساتھ کیا تھا، پورا کرنے کے لیے چودہ برس کے بن باس جانے کے لیے ماں سے رخصت لینے کی غرض سے اُس کے پاس جاتے ہیں۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی اس نظم میں وہ اثر و تاثیر ہے کہ یہ لاکھوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی ہے۔ سلاست، روانی اور اثر و تاثیر اس نظم کی خصوصیات میں شمار ہیں۔ ذیل میں اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

پہلا بند۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام / راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام / دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس، تو غم ہوگا اور بھی

تشریح: جب شری رام چندر کو بن باس ہوا تو انھوں نے بہ خوشی اسے قبول کر لیا۔ لہٰذا اللہ کا نام لے کر بن جانے کے لیے والد سے رخصت لی۔ والد سے رخصت گویا وفا کی راہ کی پہلی منزل انھوں نے پالی۔ اب ان کو ماں کی زیارت کرنی تھی۔ گویا ماں سے ملنا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے دامن سے آنسوؤں کو پونچھا اور خود اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر ہم نے ذرا بھی بے کسی کا اظہار کیا تو ماں کو، جو پہلے ہی بہت دکھی ہے اور دکھ ہوگا اور اگر اس نے ہمیں اداس دیکھا تو اس کے غم کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام   بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام   قائم اُمید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں   ہے دن کی دھوپ، رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں   وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار   موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ ہے رب چمن آرائے روزگار   وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر   صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر   رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت، دامنِ مادر سے کم نہیں

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر   ہنس کر بغور یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر   جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پیدا جو بے کسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں پہ آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان   لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان   بچے ہو، اس کا علم نہیں تم ہو بے گمان
اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ ممتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر، ہے یہ مرا وقت واپسیں   کیا اعتبار؟ آج ہوں دُنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس دل کو ہے یقیں   سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں؟
اولاد جب بھی تمھیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں   باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں   جاؤ سدھارو! خوش رہو میں روتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

آخر تھے رام کے لیے یہ حرفِ آرزو   دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو   سننی پڑے اُسے یہ نجات کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں میں ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند   رُک رُک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہنچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند   مرنا مجھے قبول ہے، جینا نہیں پسند
جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لیے
دوزخ یہ زندگی ہے اُس اولاد کے لیے

ایسے بھی ہنر اور ہمت آئیں گے نظر   مگر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا ابھی نخلِ تمنا جو بے ثمر   یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ   منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ   اب یہاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز   اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز   لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور   مایوس کیوں ہیں آپ؟ الم کا ہے کیوں وفور؟
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور   لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل، یہ فریب، یہ سازش، یہ شور و شر   ہوتا ہے سب اُسی کے بہانے میں سر بسر
اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر   کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار   واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار   ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب   جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب   پیری مٹی کسی کی، کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی   قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی   ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال   ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال   خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا؟

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار   کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار   یہ جانتے نہیں وہ ہے داناے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اکائی: ۹

برج نرائن چکبست

نظم "رامائن کا ایک سین"

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا وا تھا دہان، زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں! میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں؟
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں؟

دُنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید؟ اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو؟ کوئی نہیں جانتا یہ بھید سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد؟ ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے؟

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں، پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

اس دریا کے حسن میں اضافہ کر رہی ہو۔ اے گنگا تم ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر شور مچاتی ہوئے بہتی ہو اور تیرے اس شور وغل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم حقیقت کے جلوے کو پانے کے لئے ابتدا ہی سے بے قرار ہو اور اس جلوے کی پیاسی ہو تم ہمالیہ سے نکل کر میدانوں میں زمین پر موتی نثار کرتی ہوئی چل رہی ہو اور اپنے عقیدت مندوں کو درشن دینے کی غرض سے تم ہردوار آئی اور یہاں ہر عقیدت مند تیرے دیدار کر کے اپنی زندگی سپھل بناتا ہے۔ یعنی نجات حاصل کرتا ہے۔

پانچواں بند:

یہ جوش سبزہ و گل، یہ تیری آبیاری
قدرت کے چپے چپے پہ شگوفہ کاری
ہندوستاں کو تو نے جنت نشاں بنایا
نہریں کہاں کہاں ہے، تیرے کرم کی جاری
اے آب رود گنگا موجوں میں تیری مل کر
موج سراب ہستی ہو بے نشاں ہماری
بعد فنا ہمارے پھولوں میں بو ہو تیری
گم ہوں راہ طلب میں اور جستجو ہو تیری

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتا ہے کہ اے گنگا ندی تیری آبیاری کے سبب چاروں اور گھاس، سبزہ اور پھول کھلے ہوئے ہیں اور اپنے حسن کا جلوہ بکھر رہے ہیں ان پھولوں اور سبزہ زار کی وجہ سے قدرت کے چپے چپے پر تیری شگوفہ کاری جلوہ گر ہے۔ تو نے ہندوستان کو جنت کے جیسا بنا دیا ہے تیری نہریں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور ہر جگہ پر ان کا رحم و کرم جاری ہے۔ اے دریائے گنگا تیری لہروں میں مل کر ہماری زندگی بے نشان ہو جائے یعنی بعد از مرگ جب ہمارے پھول یعنی ہڈیاں تیرے پانی کے سپرد کی جائیں تو ان میں تیری خوشبو بس جائے اور ہماری روح کی تسکین کا سامان ہو جائے۔ تاکہ ہم تیری تلاش میں محو ہو جائیں اور ابدی مسرت حاصل کر لیں۔ شاعر کی یہی خواہش ہے کہ اس کی زندگی کی آخری نشانی تیری نذر ہو جائے اور وہ ابدی مسرت حاصل کر سکے یہی اس کی زندگی کا اصل مقصد بھی ہے۔

چھٹا بند:

میٹھو سواد تجھ سے ہیں وادیاں ہماری
اور کشت آرزو ہو رشک جناں ہماری
وہ دن بھی ہوگا، ہوں گے جب ہم غریق رحمت
اور تیری نذر ہوں گی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا بعد فنا اٹھا کر
برباد ہو نہ مٹی اے آسماں! ہماری
یارب نہ دفن کر کے احباب بھول جائیں
لے کر ہمارے خوش خوش، گنگا کو پھول جائیں

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ اے گنگا تری وجہ سے ہماری وادیاں جنت کی مانند حسین و جمیل ہیں اور وہ جنت بے نظیر کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ہماری کھیتاں بھی سرسبز ہیں ہماری وادیاں اور کھیت دیکھ کر ہر کوئی رشک کرتا ہے۔ ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ ہم کو یہ جنت حاصل ہو جسے دیکھ کر جنت کی وادی کو رشک ہوا ہے شاعر اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ہم مر جائیں اور ہم خدا کی رحمت میں غرق ہو جائیں تو ہماری ہڈیاں تیرے پانی کی نذر کی جائیں۔ شاعر اپنے چاہنے والوں سے کہتے ہیں کہ موت کے بعد ہماری ہڈیوں کو اٹھا کر گنگا میں پھینک آنا کہ ہماری مٹی برباد نہ ہو جائے۔ اے خدا انہیں جلا کر ہمارے دوست بھول نہ جائیں وہ ہمارے پھول یعنی ہڈیاں اور راکھ کو خوشی خوشی گنگا کے سپرد کریں۔ تاکہ ہماری روح کو تسکین ہو اور ہماری آخری آرزو بھی پوری ہو جائے۔

ساتواں بند:

آئے اجل کی زد پہ جب اپنی عمر فانی
اور ختم رفتہ رفتہ ہو کھیل زندگانی
دنیا سے آہ! جب ہو اپنے سفر کا ساماں
بالیں پہ اقربا ہوں سرگرم نوحہ خوانی
جب ہونٹ خشک ہوں اور دشوار ہو تنفس
احباب اپنے منہ میں ٹپکائیں تیرا پانی
ہنستے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں
دنیا سے پی کے تیری الفت کا جام جائیں

تشریح: نظم کے آخری بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ میری خواہش ہے کہ اپنی فانی زندگی جب موت کے قبضے میں آنے لگے اور آہستہ آہستہ زندگی کا طوفان تھمنے لگے یعنی جب ہم اس دنیا سے کوچ کرنے لگیں۔ اس دنیا سے جانے کا جب ہمارا سفر شروع ہو۔ ہمارے عزیز و اقربا ماتم کرنے لگیں۔ جب ہمارے ہونٹ خشک ہو جائیں اور سانس لینا بھی مشکل ہو جو موت ہمیں اپنے آغوش میں لے رہی ہو تب میرے دوست تیرا مقدس پانی میرے منہ میں ٹپکائیں تاکہ تیری محبت کا جام پی کر ہم اس دنیا کے سفر سے ہنستے ہوئے کامیاب ہو کر گزر جائیں۔ اور موت کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جائیں۔

☆☆☆

کسی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تیری تجلی اور تیری چمک زندگی کے ایک نئے معنی سمجھاتی ہے۔ تیرے نور میں خدا کی شان پائی جاتی ہے۔ اگرچہ جمنا ندی تیری سکھی ہے لیکن اس میں تجھ جیسی صفائی اور پاکیزگی کہاں ہے۔ تو سب دریاؤں میں حسین اور پاکیزہ ہے۔ اے دریائے گنگا تیرا دامن گناہ کے داغ سے پاک ہے۔ یعنی تم آلودگی سے پاک ہو اور سرتاپا نیکی اور پرہیزگاری کا لباس زیب دیتا ہے۔ یعنی تم سر سے لے کر پاؤں تک پاک ہو اور پرہیزگاری کی مورت ہو۔ حسن کی تم ایک خوبصورت تصویر ہو۔ ابتدا سے ہی تم حسین ہو۔ خدا نے تیری صورت بڑی موہنی بنائی ہے جو ہر دل کو موہ لیتی ہے۔ اے گنگا تجھ پر زمانہ ناز کرتا ہے تو پرہیزگاری کی مورت ہو دیوی ہو تم بھارت کی پاک دھرتی کی دیوی ہو اور تجھے اس دنیا میں ماں کا درجہ حاصل ہے۔ ہم تیرے دل کے ٹکڑے ہیں یعنی ہم تیرے بچے ہیں اور تم ہماری مرادوں کا پودا ہو اور ہم تیرے پھل ہیں۔

دوسرا بند:

او پاک نازنیں! او پھولوں کے گہنے والی! سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی!
او ناز آفریں! او صدق و صفا کی دیوی! او عفت مجسم، پربت کی رہنے والی!
کل کل، یہ تیری موجوں کا گنگنانا وحدت کا یہ ترانہ او چپ نہ رہنے والی
حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی تو بحر معرفت ہے، او پاک باز ہستی

تشریح: شاعر فرماتے ہیں اے دریائے گنگا تم پاک اور ناز و ادا والی ہو تم نے پھولوں کے گہنے پہن رکھے ہیں تم سرسبز وادیوں کے دامن سے بہتی ہوئی آئی ہو۔ اے ناز و ادا والی نیکی اور پاکیزگی کی دیوی تم سراپا پرہیزگاری کا پیکر ہو تم پہاڑوں کی رہنے والی ہو۔ سبحان اللہ! تمہاری لہریں کیا خوب گیت گاتی ہیں کیا خوب ترنم ہے۔ تم ہمیشہ ایکتا اور اکھنڈتا کا گیت گاتی رہتی ہو تمہارا پانی کبھی خاموش نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اتحاد و وحدت کا ترانہ چھیڑے رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اے گنگا تیرا غیرت مند حسن دنیا سے بے نیاز ہے تو معرفت کا سمندر اور پاکیزگی اور صفائی کا پیکر ہو۔

تیسرا بند:

آج تجھ کو جستجو ہے کس بحر معرفت کی ہم پر تو کچھ حقیقت کھلی نہیں جہاں کی
اے پردہ سوز امکاں! اے جلوہ ریز عرفاں تو شمع انجمن ہے کس بزم دل ستاں کی
کیوں جادۂ طلب میں پھرتی ہے کشاں کشاں تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی
جاتی ہے تو کہاں کو آتی ہے تو کہاں سے دل بستگی ہے تجھ کو کس بحر بے نشاں سے

تشریح: اس بند میں شاعر دریائے گنگا سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ تم خود معرفت کا سمندر ہو اب تجھے کس بحر معرفت کی تلاش ہے۔ کہ جس کو حاصل کرنے کے لئے تم مسلسل کوشش کر رہی ہو۔ دنیا کی سچائی اور حقیقت کا راز ہم پر تو کھلا نہیں یعنی ہم دنیا کے راز سے واقف نہیں ہو سکتے ہم اس میں قاصر ہیں۔ اے گنگا تیرے حسن میں سوز ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تیرے اندر ہزاروں جلوے چھپے ہوئے ہیں جو معرفت کا دروازہ کھولتے ہیں۔ غرض آپ کا حسن سراپا راز ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا تم کس بزم دل کی شمع ہو۔ تم ایک جگہ سے دوسری جگہ کشاں کشاں پھر رہی ہے تم کو کس منزل مقصود کی تلاش ہے۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ تمہیں کس گم گشتہ قافلے یعنی بچھڑے ہوئے قافلے کی تلاش ہے۔ تم کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہو اور تیری منزل کہاں ہے۔ تجھے کس بے نام و نشاں سمندر کی تلاش ہے۔ تجھے کس سے دل لگی ہے ہم ان سب رازوں سے نا آشنا ہیں۔

چوتھا بند:

آئی نظر تجلی جب شاہد ازل کی ذروں میں جا کے چمکی، پھولوں میں جا کے مہکی
ہندوستاں ہے اک دریائے حسن فطرت اور اس میں پنکھڑی ہے تو خوش نما کنول کی
نکلی ہمالیہ سے تو پُر خروش ہو کر تو آدا تشنہ لب تھی اس جلوۂ ازل کی
گرتی ہوئی زمیں پر موتی نثار آئی دامن کو اپنے بھر کے تو جلوہ دار آئی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتا ہے کہ ابتدا میں جب اس دنیا میں خدا کا نور دکھائی دیا ہو گا تب سے ہی دریائے گنگا کے ذرے چمکے ہوں گے اور تیری وادیوں میں پھول مہکے ہوں گے اور تب سے ہی قدرت کے جلوے تجھ میں سما گئے ہوں گے۔ اگر ہم ہندوستان کو قدرت کے حسن کا دریا تصور کریں تو تم اس دریا میں کھلے خوش نما کنول کی ایک خوبصورت پنکھڑی ہو جو

کیوں جادۂ طلب میں پھرتی کشاں کشاں ہے
تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی

جاتی ہے تو کہاں کو آتی ہے تو کہاں سے
دل بستگی ہے تجھ کو کس عرصہ نشاں سے

آئی نظر تجلی جب شاہدِ ازل کی
ذروں میں جا کے چمکی، پھولوں میں جا کے مہکی

ہندوستاں ہے اک دریائے حسنِ فطرت
اور ان میں بکھری ہے تو خوش نما کنول کی

نکلی ہمالیہ سے محوِ خروش ہو کر
تو آہ! تشنہ لب تھی اس جلوۂ ازل کی

کرتی ہوئی زمیں پر موتی نثار آئی
وحشی کو اپنے ہمرہ کے تو ہردوار آئی

یہ جوشِ سبزہ و گل، یہ تیری آبیاری
قدرت کے چپے چپے پہ یہ شگفتہ کیاری

ہندوستاں کو تو نے جنت نشاں بنایا
نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری

اے آبِ رودِ گنگا موجوں میں تیری مل کر
موجِ سراب جیسی ہو بے تکاں ہماری

بعدِ فنا، ہمارے پھولوں میں بو ہو تیری
گم ہوں رہِ طلب میں اور جستجو ہو تیری

معمور سواد تجھ سے ہیں وادیاں ہماری
اور کشتِ آرزو ہو رشکِ جناں ہماری

وہ دن بھی ہوگا، ہوں گے جب ہم غریقِ رحمت
اور تیری نذر ہوں گی یہ ہڈیاں ہماری

گنگا میں پھینک آنا بعدِ فنا اُٹھا کر
برباد ہو نہ مٹی اے آسماں! ہماری

یارب نہ دفن کر کے احباب بھول جائیں
لیکر ہمارے خوش خوش، گنگا کو پھول جائیں

آئے اجل کی زد پہ جب اپنی عمرِ فانی
اور ختم رفتہ رفتہ ہو جبلِ زندگانی

دنیا سے آہ! جب ہو اپنے سفر کا ساماں
بالیں پہ اقربا ہوں سرگرم نوحہ خوانی

جب ہونٹ خشک ہوں اور دشوار ہو نفس
احباب اپنے منھ میں ٹپکائیں تیرا پانی

چلتے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں
دنیا سے پی کے تیری الفت کا جام جائیں

☆☆☆

تعارف: ''گنگا'' سرور جہاں آبادی کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی حب الوطنی کا اظہار نہایت ہی والہانہ لب و لہجہ میں کیا ہے۔ سرور بڑے آزاد خیال اور رند مزاج کے آدمی تھے۔ اُن کی شخصیت تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھی۔ وہ سچے قوم پرست تھے۔ حب الوطنی کے جذبے سے مالا مال اُن کی اس نظم کا شمار اُردو کی بلند پایہ نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دریائے گنگا کے فطری مناظر کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ انداز بیان سیدھا سادہ مگر پُر اثر ہے۔ خوبصورت تشبیہات، استعارات اور مناسب تراکیب کے استعمال سے نظم کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ انھوں نے دریائے گنگا کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اسے دریائے جنت کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اور آخر میں شاعر نے اسی میں سما جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظم قدرت کے مناظر اور حب الوطنی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

نظم ''گنگا'' کی تشریح

پہلا بند:

اے آبِ رودِ گنگا! اُف رے تیری صفائی
یہ تیرا حسن دلکش، یہ طرزِ دلربائی

تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروشِ ہستی
تنویر میں ہے تیری اک شانِ کبریائی

جمنا تیری سہیلی، گو ساتھ کی ہے کھیلی
اس میں مگر کہاں ہے؟ تیری سی وہ صفائی

بے لوث تیرا دامن ہے داغِ معصیت سے
موزوں ترے قد پہ قبائے پارسائی

حسنِ ازل کی گویا اک عکس ہے صورت
صانع نے تیری صورت کیا موتی بنائی

اے نازشِ زمانہ اے آتش ناز صفت
بھارت کی پاک دیوی! تو ہے ہماری مائی

دل بند ہم ہیں تیرے لختِ جگر ہیں تیرے
نخلِ مراد ہے تو، اور ہم ثمر ہیں تیرے

تشریح: مندرجہ بالا اشعار سرور جہاں آبادی کی نظم ''گنگا'' سے ماخوذ ہیں۔ اس نظم میں سرور جہاں آبادی نے دریائے گنگا کے حسن، خوبصورتی اور پاکیزگی کو موضوع بنایا ہے۔ متذکرہ بالا اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ اے دریائے گنگا کے پانی تو کتنا صاف ہے۔ تمہارے حسن، دلکشی اور دلربائی کی جتنی تعریف کی جائے اُتنی کم ہے۔ تیرا یہ حسن اور دلکشی ہر

امتحانی سوالات:

۱۔ سرور جہاں آبادی کی نظم نگاری پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ نظم "گنگا" میں شاعر نے کس چیز کو پیش کیا ہے؟

۳۔ نظم "مادر وطن" میں شاعر نے کیا چیز پیش کی ہے؟

۴۔ "گنگا" اور "مادر وطن" کی فنی خصوصیات بیان کیجیے۔

اکائی:۸

سرور جہاں آبادی

نظم "گنگا"

اے آب رود گنگا! اف ری تیری صفائی
یہ تیرا حسن دلکش، یہ طرز دل ربائی

تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروش معنی
تنویر میں ہے تیری اک شان کبریائی

جمنا تیری سہیلی، گو ساتھ کی ہے کھیلی
اس میں مگر کہاں ہے؟ تیری سی وہ صفائی

بے لوث تیرا دامن بے داغ معصیت سے
موزوں ترے قد پر ملبوس پارسائی

حسن ازل کی گویا اک ٹکڑا ہے مورت
صانع نے تیری صورت کیا موہنی بنائی

اے نازش زمانہ! اے نقش ناز ملت
بھارت کی پاک دیوی! تو ہے ہماری مائی

دل بند ہم ہیں تیرے لخت جگر ہیں تیرے
نخل مراد ہے تو، اور ہم ثمر ہیں تیرے

او پاک نازنیں! او پھولوں کے گہنے والی!
سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی!

او ناز آفریں! او صدق و صفا کی دیوی!
او عصمت مجسم، پربت کی رہنے والی!

صل علیٰ، یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانہ، او چپ نہ رہنے والی

حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی
تو بحر معرفت ہے، او پاک باز ہستی

آج تجھ کو جستجو ہے کس بحر معرفت کی
ہم پر تو کچھ حقیقت کھلی نہیں جہاں کی

اے پردہ سوز امکاں! اے جلوہ ریز عرفاں
تو شمع انجمن ہے کس بزم دل ستاں کی

شاعر بند کے آخری شعر میں کہتا ہے کہ اے شفقت کرنے والی ماں تیری شفقت کا سایہ ہمیشہ رہا ہے کہ تیرے مسکنوں پر تیری خاک کے ذرے ذرے پہ ناز ہے۔

دوسرا بند۔

اُف یہ تیری چاندنی راتوں کے منظر خوشنما	وہ ادا اشجار یہ پھولوں کے زیور خوشنما
سو تبسم تیرے انداز تکلم پر نثار	دل کو کرتی ہیں تری دل کش صدائیں بے قرار

سرزمیں عیش ہے اے مادرِ دل سوز تو

آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز تو

تشریح: کہ اے مادرِ وطن چاندنی راتوں کے تیرے منظر کتنے حسین ہیں۔ تو پھولوں، پھلوں اور اشجار سے سجی ہوئی دلہن کی مانند ہے۔ تیری ایک مسکراہٹ پر سینکڑوں مسکراہٹیں قربان ہیں۔ تیری دل کش صدائیں بے قرار کرتی ہیں۔ تیری پاس آنے کی تڑپ پیدا کرتی ہیں۔ اے ہمدرد ماں تیری زمین عیش و عشرت کا گہوارہ ہے۔ تو وہ آرزوؤں کی محفل ہے جو انبساط و خوشی کو دوبالا کرتی ہے۔

تیسرا بند۔

تُو جوانوں کی ہے ہمت، تُو دلیروں کی سپر	کانپتے ہیں دشمنوں کے تیری ہیبت سے جگر
نورِ دانش تُو ہی، فروغِ جلوۂ ایماں ہے تو	دل ہے تو سرمایۂ صبر و شکیبِ جاں ہے تُو

قوتِ بازو ہے میری مادرِ غم خوار تو

سینۂ پُر غم میں میرے ہے نفس کا تار تو

تشریح: اے مادرِ وطن اس ملک کے تو جوانوں کی ہمت ہے۔ تُو اس ملک کے بہادروں کی ڈھال ہے کہ تیرے خوف سے دشمنوں کے جگر کانپ جاتے ہیں اور وہ حوصلہ شکن ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تو دانش و فہم کی روشنی ہے گویا تیری ہی گود سے حکمت و دانش کا سبق ملتا ہے اور تو ایمان کو فروغ دینے والی ہے۔ تو ہمارا دل ہے اور ہماری جان کے صبر و قرار کا سرمایہ ہے۔ تو ہمارے بازوؤں کی قوت ہے۔ میرے اس غم زدہ دل اور سینے میں تُو گویا سانس کے تار کی طرح ہے۔ یعنی تیرے ہی دم سے ہماری زندگی ہے۔

چوتھا بند۔

تو اک دیوا ستھان، دیوی دل کے کاشانے میں ہے	تیری تصویرِ مقدس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی ہے تُو، زمانے میں اُجالا ہے تیرا	ہر کنول کا پھول، پانی میں شوالہ ہے تیرا
سرسوتی کا روپ ہے، درگا کا ہے اوتار تُو	خلق و دانش کی ہے دیوی مادرِ غم خوار تُو

واہ یہ مندر عجب تیری یہ سانولی صورت تیری

دل کے مندر کی ہے مورت موہنی صورت تیری

تشریح: شاعر مادرِ وطن کو دیوی کہتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے اس دل کے گھر میں اے دیوی تیرا مسکن ہے اور ہر مندر میں تیری پاک تصویر ہے۔ تُو لکشمی ہے دنیا میں اجالا کرتی ہے۔ پانی میں ہر کنول کا پھول تیرا مندر ہے۔ شوالہ سرسوتی کا روپ ہے اور شکتی درگا کا اوتار بھی ہے۔ اے سب کے غم بانٹنے والی ماں تُو زباں و دانش کی دیوی ہے۔ تیری سانولی اور خوبصورت عجب اور دل کو موہنے والی صورت ہمارے دل کے مندر میں ہے۔

پانچواں بند۔

یہ تبسم ہائے شیریں، یہ ادائے دل نواز	واہ یہ شفقت بھری تیری صدائے دل نواز
سبزہ خودرو کا گہوارہ ہے تیری سرزمیں	تختۂ خلدِ بریں ہے تیری خوش منظر زمیں
پاک گنگا جل سے بڑھ کر ہے ترا آبِ طہور	تیرے پاکیزہ ثمر ہیں میوۂ شاخِ سرور

آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تُو

خلد کی ہے پاک دیوی مادرِ دم ساز تُو

تشریح: اے مادرِ وطن تیری میٹھی ہنسی اور ادائیں اور یہ ہمدردی سے بھری تیری صدائیں بڑی دل نواز ہیں۔ تیری زمین خوبصورت مناظر لیے ہوئے ہے۔ تیری سرزمین جیسے خوبصورت سبزے کا جھولا ہے۔ تیرے یہ خوبصورت مناظر زمینِ جنت کا نظارہ پیش کرتے ہیں جیسے جنت کی کیاری ہے۔ یہ تیرا پاکیزہ پانی گنگا جل سے بڑھ کر ہے اور تیرے یہ پاکیزہ اور میٹھے خوش ذائقہ پھل شاخِ سرور کے میوے ہیں۔ تُو خدا کے نور کی جلوہ گاہ ہے۔ تو وہ جگہ ہے جہاں آسمان اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ اے ماں تُو سورگ کی کوئی دیوی ہے۔

تراویا استھان، دیوی اول کے کاشانے میں ہے — تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے
کاشی ہے تو، زمانے میں اجالا ہے تیرا — ہر کنول کا پھول، پانی میں شوالہ ہے تیرا
سرسوتی کا روپ ہے، درگا کا ہے اوتار تو — لکشمی و دانش کی ہے دیوی، مادرِ غم خوار تو

واہ یہ سندر چھب تیری، یہ سانولی صورت تیری
دل کے مندر کی ہے مورت، موہنی صورت تیری
یہ تبسم ہائے شیریں، یہ ادائے دل نواز — واہ یہ شفقت بھری تیری صدائے دل نواز
سبزۂ خودرو کا گہوارہ ہے تیری سرزمیں — تختۂ خلدِ بریں ہے تیری خوش منظر زمیں
پاک گنگا جل ہے بڑھ کر تیرا آبِ طہور — تیرے پاکیزہ ثمر ہیں میوۂ شاخِ سرور
آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو
خلد کی ہے پاک، دیوی، مادرِ دمساز تو

☆☆☆

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
جاں بخش	جان بخشنے والا،	ظلِ شفقت	شفقت کا سایہ
	جان دینے والا	مشفق	شفقت کرنے والا
تروشاداب	تروتازہ اور سرسبز	اشجار	شجر کی جمع، درخت
شیریں	میٹھے	تبسم	بات کرنا، گفتگو کرنا
خوش گوار	خوش ذائقہ	تکلم	بات کرنا، گفتگو کرنا

دل سوز	ہمدرد	اجالا	روشنی
[illegible]	خوشی بڑھانے والی	شوالہ	شو کا مندر، مندر
[illegible]	احوال	تکلم	زبان
ہیبت	ڈر، خوف	چھب	صورت
دانش	عقل، فہم	موہنی	دل کو موہنے والی
صبر و شکیب	صبر و قرار	گہوارہ	پنگھوڑا
کاشانہ	چھوٹا گھر	آبِ طہور	پاکیزہ آب
صنم خانہ	مندر، پوجا گھر	ثمر	پھل، میوہ

تعارف: بیسویں صدی کے ممتاز شعراء میں سرورؔ جہاں آبادی کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے ہاں بیشتر فطرت کی مصوری اور حب الوطنی کے ترانے ملتے ہیں۔ یہ نظم مادرِ وطن بھی اپنے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم میں منظر کشی کی اچھی مثالیں بھی ملتی ہیں اور وطن کے تئیں محبت کا جذبہ بھی۔ پانچ بندوں پر مشتمل اس نظم میں سرورؔ نے وطن کی ہر چیز سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ انداز و اسلوب بھی بڑا دل کش اختیار کیا ہے۔

پہلا بند:

واہ یہ جاں بخش پانی، یہ ہوائے خوش گوار — یہ تروشاداب و شیریں میوہ ہائے خوش گوار
ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں ڈوبی ہوئی بادِ جنوب — سبز کھیتوں کی ہوائیں اور میدانوں کی دھوپ
ظلِ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق دراز
خاک پر کیا کیا تری، تیرے طفلوں کو ہے ناز

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ اے مادرِ وطن تیرا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی اور خوش گوار ہوا جان بخشنے والے ہیں۔ تیرے پانی میں آبِ حیات کی تاثیر ہے اور تیرے تروتازہ اور میٹھے میوے نہایت خوش ذائقہ ہیں۔ تیرے جنوب کی ہوائیں ایسی معطر ہیں جیسے عطر میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ سرسبز لہلہاتے کھیت اور میدانوں پر دھوپ کے منظر نہایت خوبصورت اور دل کش ہیں۔

شعر (۱۲) اس شعر میں اکبر الٰہ آبادی خود اپنے سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے اکبر زمانے میں جو انقلاب برپا ہو رہا ہے تمہیں اس انقلاب سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہماری زندگی اب ختم ہونے والی ہے یعنی وہ دن بالکل قریب ہے جب نہ تم زندہ ہوں گے اور نہ ہی میں زندہ ہوں گا۔ اس لیے ہمیں ان تبدیلیوں سے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ کوئی خطرہ ہے اور نہ کوئی غم ہے۔

اِکائی: ۷

سرور جہاں آبادی

مادرِ وطن

واہ یہ جاں بخش پانی، یہ ہوائے خوش گوار — میوۂ شاداب و شیریں میوہ ہائے خوش گوار
ٹھنڈی ٹھنڈی سحر میں ڈوبی ہوئی بادِ جنوب — سبز کھیتوں کی ادائیں اور میدانوں کی زیب

ظلِ شفقت جو ترا اے مادرِ مشفق دراز
خاک پر کیا کیا تری، تیرے گلشن کو ہے ناز

اُف یہ تیری چاندنی راتوں کے منظر خوش نما — واہ یہ اشجار یہ پھولوں کے زیور خوش نما
سو تبسم تیرے اندازِ تکلم پر نثار — دل کو کرتی ہیں تری دل کش صدائیں بے قرار

سرزمینِ عیش ہے اے مادرِ دل سوز تو
آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز تو

تو ہی جوانوں کی ہے ہمت، تو ہی دلیروں کی سپر — کانپتے ہیں دشمنوں کے تیری ہیبت سے جگر
نورِ دانش تو ہی، فروغِ جلوۂ ایماں ہے تو — دل ہے تو سرمایۂ صبر و شکیبِ جاں ہے تو

قوتِ بازو ہے میری مادرِ غم خوار تو
سینۂ پرغم میں میرے ہے تپش کا تار تو

نظم "مستقبل" کی تشریح

اکبر الٰہ آبادی نے اپنی تخلیق "مستقبل" میں متعدد خدشات اور موجودہ دور میں جو رہن سہن کے طور طریقے، رسم و رواج ہیں "مستقبل" میں بدل جانے کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔ ان میں حسین لوگ اپنی زندگی میں خوب صورتی اور چمک دمک اور بناؤ سنگار کا مظاہرہ کریں گے۔ عورتیں پردے کی پابندی ہٹا دیں گی یعنی وہ بے پردہ ہوں گی۔ مستقبل میں لوگوں کی طبیعتوں کا انداز ہی بدل جائے گا۔ لوگ مشرق کی بجائے یورپ کی تقلید کرنے میں مصروف ہوں گے۔ انسانوں کے عقیدوں میں بے حد تبدیلی دیکھنے کو ملے گی وغیرہ۔ اس طرح کے اندیشہ ہائے دور دراز کا ذکر کیا ہے۔

شعر۱: اس شعر میں اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں رہن سہن کے جو طریقے، رسم و رواج ہیں یہ سب ختم ہو جائیں گے۔ ایک وقت آئے گا جب ان طریقوں کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ اور ان کی جگہ نئے طریقے اور نیا طرزِ زندگی ہو گا۔ زندگی گزارنے کے لیے نئے نئے سامان ہوں گے۔

شعر۲: اس شعر میں شاعر حسین لوگوں کی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حسین لوگ نئے طور طریقوں سے اپنی خوبصورتی اور چمک دمک اور بناؤ سنگار کا مظاہرہ کریں گے۔ اس وقت ناچ اور رنگ کے یہ طریقے نہیں ہوں گے جو موجودہ دور میں ہیں۔ حسینوں کی زلفوں میں آج کی طرح پیچ و خم ہوں گے اور نہ گیسو میں بل ہوں گے۔ یہ سب بدل جائے گا اور اس کی جگہ نیا طرزِ زندگی ہو گا۔

شعر۳: اس میں شاعر فرماتے ہیں کہ مستقبل میں عورتوں میں پردہ داری کا رواج ختم ہو جائے گا۔ آج کی طرح عورتیں اپنے چہرے پر گھونگھٹ ڈال کر نہیں چلیں گی۔ اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کریں گے۔ یعنی موجودہ گھونگھٹ کا رواج ختم ہو کر رہ جائے گا۔

شعر۴: اس میں اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں کہ مستقبل میں لوگوں کی طبیعتوں کا انداز ہی بدل جائے گا۔ آسمان بھی اپنا رنگ بدل ڈالے گا۔ یعنی نیا زمانہ نئے حالات سے منظرِ عام پر آئے گا۔ خوشیوں اور غموں کو منانے کے لیے نئے نئے طریقے ہوں گے اس وقت موجودہ دور کے رسم و رواج میں سے کچھ نہیں ہو گا۔

شعر۵: اس شعر میں شاعر نے آنے والے وقت میں موسم کی تبدیلی کا پتہ دیا ہے۔ یعنی آنے والے زمانے میں نئے نئے پھول کھلیں گے اور ان پھولوں پر بیٹھ کر بلبل کے بولنے اور گیت گانے کا انداز بھی نیا ہو گا یعنی بدلا ہوا ہو گا۔

شعر۶: اکبر الٰہ آبادی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ قوم میں تبدیلی آنے کی وجہ سے لوگوں کے عقائد بدل جائیں گے۔ ملت کے اصولوں اور عقیدوں میں وسیع پیمانے پر ترمیمات کا عمل ہو گا۔ یعنی عقائد پر قیامت برپا ہو گی۔ لوگ نیا کعبہ بنائیں گے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی خواہشات امنگوں اور تمناؤں کا نیا کعبہ ہو گا اس نئے کعبہ کے بت بھی مغربی طرز کے ہوں گے۔

شعر۷: اس شعر میں شاعر کہتے ہیں کہ مستقبل میں لوگ یورپ کی پیروی میں گیت گائیں گے اور راگ الاپیں گے لیکن ان میں میل جول نہیں ہو گا۔ ان نغموں میں نہ سوز ہو گا اور نہ روح کی پاکیزگی ہو گی یعنی سب کچھ بے تال و سُر ہو گا۔

شعر۸: اس شعر میں شاعر نے کہا ہے کہ نئی تہذیب نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرے گی۔ یعنی آج کل ہمارے زمانے میں زبان میں جو اصطلاحات استعمال ہو رہی ہیں آنے والے زمانے میں وہ بالکل نہیں ہوں گی مغربی اصطلاحوں کی بھرمار ہو گی۔ مغرب ہی کی لغت ہو گی اور مغربی زبان ہو گی۔

شعر۹: اس شعر میں شاعر مستقبل میں شرافت، شان و شوکت کا معیار پرکھنے کے انداز کے متعلق فرماتے ہیں کہ دنیا کی نظروں میں شرافت کا معیار پرکھنے کا انداز ہی بدل جائے گا جو لوگ آج کل بزرگی اور عظمت والے ہیں اور بلند مرتبہ رکھتے ہیں ان کی قصہ لازم رہ جائے گی۔ اور ان کو حقیر سمجھا جائے گا۔

شعر۱۰: اکبر الٰہ آبادی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ گزرے ہوئے زمانے میں جو لوگ عظمت و بزرگی، شرافت اور بلند مرتبہ والے تھے۔ جن کا ہم بار بار تذکرہ کرتے ہیں ان کا ذکر صرف افسانوں کی کتابوں میں رہ جائے گا اور ان کی جاہ و حشمت ختم ہو جائے گی۔

شعر۱۱: آنے والے زمانے میں اس قسم کی جو تبدیلیاں ہوں گی ان کا کسی کو احساس و غم تک نہیں ہو گا۔ جس طریقے سے نیا اسباب پیدا ہوئے اسی طرح تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

مشکل الفاظ کے معنی:

الفاظ	معنی
عدم	نیستی، نابود
پیچ	مڑے ہوئے
زلف	بال
گیسو	سر کے لمبے بال
خم	پیچ و تاب
حاجب	دربان، چوبدار۔ (جمع حواجب)
گردوں	آسمان
قیامت	قائم ہونا، روزِ حشر
ملت	مذہب، قوم، (مثل، میلاپ، ملنساری)
زمزمے	گیت
مغنی	غنی
تقلید	پیروی
لغات	لغت کی جمع فرہنگ، زبانیں
آشنا	واقف
چشم	آنکھ
زعم	گمان، خیال
گزشتہ	گزرا ہوا
عظمتوں	بزرگی، بڑائی
جاہ	جگہ (حشمت، بڑائی)

حشم	نوکر چاکر، نوکروں کی بھیڑ (عظمت، بڑائی)
تغیر	تبدیلی
زیر و بم	طبلے یا ڈھولک کا دایاں رخ، نیچا اونچا سرا

اکائی:٦

اکبرالہ آبادی

نظم ''مستقبل''

مقاصد: اس اکائی میں اکبرالہ آبادی کی دو نظموں ''ایک فرضی لطیفہ'' اور ''مستقبل'' کی تشریح اور ان دونوں نظموں کی اہمیت سے طلبا اور طالبات کو روشناس کرانا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی فنی خصوصیات سے آگاہی حاصل کرانا مطلوب ہے تاکہ وہ اکبرالہ آبادی کے کلام کو سمجھ سکیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

نظم

۱ : یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

۲ : نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

۳ : نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

۴ : بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے

نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے

۵ : خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل، زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

۶ : عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے

۷ : بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے

۸ : ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہو گی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے

۹ : بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا سے
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں، وہ سب سے کم ہوں گے

۱۰ : گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

۱۱ : کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا، نہ غم ہو گا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

۱۲ : تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے، وہ دن، نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

کارویں اور اسی سے قوم کو فروغ حاصل ہوگا اور اسی جدید علوم کے حصول سے باپ اور اولاد کے نام بھی روشن ہوں گے۔ اکبر الٰہ آبادی اگرچہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے تاہم وہ انگریزی تعلیم کو تعصب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسا کرنے سے اکبر کی تنگ نظری اور دقیانوسی سوچ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

شعر ۱۰ مکان کالج کے سب مکیں ہیں، ابھی انہیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل، ہیں کیسے جادے؟

تشریح: اس شعر میں شاعر مدرسہ علی گڑھ کے لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ابھی ناتجربہ کار ہیں۔ ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ ہم کس طرف چل رہے ہیں اور ہماری منزل کس طرف ہے اور ہمارا راستہ کونسا ہے۔ ان کو قوم کے مستقبل کا بالکل شعور نہیں ہے۔ لہٰذا یہ قوم کو غلط راستے پر لے کے جا رہے ہیں۔

شعر ۱۱ دلوں میں اُن کے ہے نورِ ایماں، قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق، ادائے طفلی، یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے

تشریح: اس شعر میں شاعر فرماتے ہیں کہ ان کے دلوں میں نورِ ایمان تو ہے لیکن اُن کے ارادے جدید علوم کے حصول کی طرف مائل ہیں اس لئے کمزور ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جدید تعلیم کی ہوا اور ان کی بچگانہ ادا ایمان کی شمع کو بجھانے کا کام کرے گویا کہیں یہ مدرسہ دین اسلام اور نورِ ایمان کا دشمن نہ ہو جائے۔

شعر ۱۲ فریب دے کر نکالے مطلب، سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو دین و مذہب، نمودِ ذاتی کو گو بڑھا دے

تشریح: اس شعر میں شاعر مدرسہ علی گڑھ اور اس سے تعلق رکھنے والے حضرات کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ مدرسے والے عوام کو فریب دے کر اپنا مطلب نکالیں اور ان کو دین و مذہب سے نفرت کرنا سکھائے اور وہ دین و مذہب کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ آخر کار دین و مذہب کو بھی مٹا کے رکھ دیں اور اپنی ذاتی

آرائش کو آگے بڑھائیں۔ غرض اپنے مفاد کے لئے اپنے قوم و مذہب کو ختم نہ کر دیں۔

شعر ۱۳ یہی بس اکبر کی التجا ہے جنابِ باری میں یہ دعا ہے
علوم و حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں، سمجھ خدا دے

تشریح: آخری شعر میں اکبر دعا کرتے ہیں کہ پروفیسر ان لوگوں کو دین اور ایمان کا سبق پڑھائیں اور ان کو اسلامی طرز کی زندگی گزارنے کے قابل بنا دیں اور خدا ان کو سمجھ اور پرکھ عطا فرمائے تاکہ یہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سکیں اسی سے مدرسہ علی گڑھ کے قیام کا اصل مقصد پورا ہو پائے گا۔

☆☆☆

چیزیں ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔

شعر: کمالِ محنت سے پڑھ رہے ہیں کمالِ غیرت سے بڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں، تو مغربی راہ میں پیادے

تشریح: اس شعر میں شاعر فرماتے ہیں کہ تعلیم کے حصول میں یہ شہزادے کمالِ محنت اور کمالِ غیرت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ شہزادے مشرق کی راہ کے سوار ہیں یعنی مغربی تہذیب اور علوم وفنون کے دلدادہ ہیں۔ وہ مشرقی علوم وفنون اور تہذیبی اقدار کے پیادے ہیں یعنی اپنے رسم ورواج سے یکسر ناواقف۔

شعر: ہر ایک ہے ان میں بے شک ایسا، کہ آپ اسے چاہتے ہیں جیسا
دکھائے محفل میں قدر، عنا، جو آپ آئیں تو سر جھکا دے

تشریح: اس شعر میں شاعر مدرسے کے میرزادوں پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان نوجوانوں میں ہر ایک ایسا ہے جیسا آپ چاہتے ہیں یعنی جیسا سرسید احمد خان چاہتے ہیں وہ طلبہ انگریزوں کی محفلوں میں اپنا خوبصورت رنگ دکھاتے ہیں یعنی بن سنور کر محفل میں شریک ہوتے ہیں اور جب کوئی اعلیٰ عہدے دار آئے تو بڑے ادب سے اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیتے ہیں گویا اس کی خوشامد کر رہے ہوں۔

شعر: فقیر مانگے تو صاف کہہ دیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا!
قبول فرمائیں آپ دعوت، تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے

تشریح: شاعر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی فقیر ان طلبہ سے کچھ مانگتا ہے تو اسے کہہ دیتے ہیں کہ تو طاقت ور ہے جا کما اور کھا مگر اگر انگریز دعوت قبول فرمائیں اور مہمان ہو جائیں تو ان پر سارا سرمایہ خرچ کر دیں۔

شعر: بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ، مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن، نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم نہ محبوب سے لگاؤ رکھتے ہیں نہ انگریزی حسینوں ناز و ادا کے دیوانے۔ اس شعر میں شاعر مس کا لفظ استعمال کر کے ان پر طنز کر رہا ہے گویا وہ یہ سارے کام کرتے ہیں اگرچہ وہ دل کے سادے اور نظر کے بھولے ہیں لیکن اپنی تمام قوت انگریزوں کی دعوتوں میں لگاتے ہیں۔

شعر: نظر بھی آئے جو زلفِ پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی ہے
الیکٹرک لائٹ اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے

تشریح: اس شعر میں شاعر ان شہزادوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ انگریز حسیناؤں کی پیچ دار زلفوں کے اسیر ہیں اور ایسے وہ کوئی قانون یا پالیسی مانتے ہیں۔ اگر کوئی بجلی کی مانند مسکرا دے تو وہ اسے الیکٹرک لائٹ خیال کرتے ہیں۔ گویا وہ بالکل سیدھے سادے ہیں اور انھیں کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

شعر: نکلتے ہیں کر کے غول بندی، بنامِ تہذیب و دردمندی
یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے، جو تم انھیں دو تمھیں خدا دے

تشریح: شاعر فرماتے ہیں کہ مدرسہ علی گڑھ والے ارباب گروہ بندی کر کے باہر نکلتے ہیں اور وہ تہذیب اور دردمندی کا سہارا دیتے ہوئے اپنی قوم کے لوگوں کے پاس مدرسہ علی گڑھ کی فلاح وبہبود کے نام پر چندہ مانگنے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اے ہماری قوم کے لوگوں آپ ہماری مدد کرو آپ کی مدد خدا کرے گا۔

شعر: انھیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کارِ دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغِ قومی، اسی سے چمکیں گے باپ دادے

تشریح: اس شعر میں شاعر فرماتے ہیں کہ مدرسہ علی گڑھ کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا سب سے بڑا

الیکٹرک لائٹ اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی، بہ نام تہذیب و دردمندی
یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے، جو تم ہمیں دو، تمہیں خدا دے
انھیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی، اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان کالج کے سب مکیں ہیں، ابھی انھیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل، ہیں کیسے جادے؟
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں، قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق، ادائے طفلی، یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب، سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو دین و مذہب، نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم و حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں، سمجھ خدا دے

تعارف: "مدرسہ علی گڑھ" اکبرالہ آبادی کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس میں انھوں نے مدرسہ علی گڑھ اور اس کے بانیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اکبر کا شمار اردو کے بڑے طنزیہ اور مزاحیہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں پہلی بار طنز و مزاح دونوں شاعر کی ذات کی تنگ اور محدود دنیا سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محض پھکڑپن اور مسخرہ پن نہیں بلکہ سنجیدگی، شائستگی اور فکر کی فضا بھی چھائی ہوئی ملتی ہے۔ اکبر اپنے دور کی زندگی کو اور اس کے مسائل کو ایک کارٹونسٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ بحیثیت مغربی اثرات کے تحت پنپنے والی جدید اقدار کے مضحک پہلوؤں پر پڑتی ہے اور وہ اپنے تخیل کی بدولت اور زبان کی مدد سے ان پہلوؤں کو اور زیادہ مضحک بنا دیتے ہیں۔ اکبر کی تہذیب کی

خامیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار بننے لگتے ہیں اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مغربیت کی خامیوں خصوصاً مغرب کی اندھی تقلید اور ظاہر پرستی کا کھل کر مذاق اڑایا ہے۔ سرسید احمد خان جو مغربیت کے دلدادہ تھے اکبر ان کا اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس نظم میں اکبرالہ آبادی نے سرسید کی کوششوں سے قائم ہونے والا مدرسہ علی گڑھ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے چونکہ وہ انگریزی تعلیم اور طرز عمل کے بالکل خلاف تھے اور سرسید مدرسہ علی گڑھ کے ذریعے انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے خواہاں تھے۔ اکبر جدید تعلیم کے بالکل خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم ہندوستانیوں کو اپنے دین و مذہب اور تہذیبی اقدار سے بیگانہ کردے گی۔ اسی لئے انھوں نے مدرسہ علی گڑھ جو جدید تعلیم کا ضامن تھا کا مذاق اڑایا ہے۔

نظم "مدرسہ علی گڑھ" کی تشریح

شعر:
خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے، شریف زادے

تشریح: یہ شعر اکبرالہ آبادی کی نظم مدرسہ علی گڑھ سے ماخوذ ہے۔ اس میں شاعر فرماتے ہیں کہ خدا علی گڑھ کے مدرسے کو ہر طرح کی بیماری سے شفا دے۔ خدا کرے اس میں کسی قسم کی برائی پیدا نہ ہو۔ دوسرے مصرعے میں شاعر اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ہدف طنز بناتے ہوئے کہتا ہے کہ اس مدرسے میں تو صرف رئیس زادے امیر زادے اور شریف زادے پڑھتے ہیں لہذا یہ مدرسہ طبقہ اشرافیہ کا ہے۔ یہ عوام کے لئے نہیں ہے۔

شعر:
لطیف و خوش وضع، چست و چالاک و صاف و پاکیزہ، شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے

تشریح: اس شعر میں شاعر فرماتا ہے کہ اس مدرسہ میں پڑھنے والے رئیس زادے، امیر زادے اور شریف زادے کس قدر لطیف اور خوش وضع قطع ہیں وہ چست و چالاک، صاف ستھرے اور خوش و خرم ہیں۔ ان کی طبیعتوں میں علم حاصل کرنے کا جوش اور دلوں میں وطن اور قوم کی خدمت کے لئے نیک ارادے ہیں۔ لیکن شاعر کی نظر میں یہ سب ظاہری

۱۳۸	تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی	چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
۱۳۹	ہے سرد ہوا بدن کو لگتی	ہر دل میں ہے آگ سی سلگتی
۱۴۰	پردیس میں سچ ہے کیا ہو کوئی شاد	جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ پردیس میں جب میں اپنے آس پاس کسی کو بھی نہیں پاتا ہوں تو میں اپنی بے بسی پر روتا ہوں اور دعائیں دیتا ہوں چونکہ اب یہی ساتھ دے رہی ہے۔ آم کا موسم آنے پر دوست ساتھ نہ ہوں تو ان کی یاد سے میرا دل بے قرار اور بے چین رہتا ہے۔ اے میرے دوستوں تمہارے بغیر پانی کے ہر بوند جو بدن پر پڑتی ہے وہ چنگاری کے جیسی معلوم ہوتی ہے۔ سرد ہوا جسم پر تو اثر کرتی ہے پر دل کے اندر جو آگ لگی ہے وہ ٹھنڈی نہیں پڑتی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جب دل میں دیس کی یاد بھری ہوئی ہو تو پردیس میں آدمی کیسے خوش ہو سکتا ہے۔

اکیسواں بند:

۱۴۱	نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی	فریاد یہ دردناک اس کی
۱۴۲	تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز	پکڑا دل بن کے اس کی آواز
۱۴۳	حیرت رہی دیر تک کہ آخر	روتا ہے کہاں کا یہ مسافر
۱۴۴	پھر غور سے اک نظر جو ڈالی	نکلا وہ ہمارا دوست حالی

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ شاعر کی آہ و پکار نشتر کی طرح دل کو چبھنے والی تھی اس کی فریاد دردناک تھی اس سوز اور اس درد سے وہ دل پکڑ کے بیٹھا ہوا تھا اور شاعر دیر تک حیران تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ یہ رونا آخر کہاں کا ہے یہ کہاں کا مسافر ہے پھر جب غور سے نظر بھر دیکھا تو وہ الطاف حسین حالی نکلا۔ حالی ہی وطن عزیز کی جدائی کے درد و غم دکھی تھا اور وہ آہ و فریاد کر رہا تھا اب وہ وطن سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ نظم کے اختتام پہ حالی نے حب الوطنی کو [illegible] خوب صورت پیرائے میں کیا ہے۔

☆☆☆

اکائی:5

اکبرالہ آبادی

نظم "مدرسہ علی گڑھ"

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے، شریف زادے
لطیف و خوش وضع، چست و چالاک و صاف و پاکیزہ و شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے
کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں، تو مغربی راہ میں پیادے
ہر اک ہے ان میں بے شک ایسا، کہ آپ اسے جانتے ہیں جیسا
دکھائے محفل میں قد رعنا، جو آپ آئیں تو سر جھکا دے
فقیر مانگے تو صاف کہہ دیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا!
قبول فرمائیں آپ دعوت، تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے
بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ، مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن، نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے
نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی ہے

دوری کا احساس برابر ستا رہا ہے۔

پچیسواں بند:

۱۲۱ برق لگنے لگی تڑپنے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار تھم تھم
۱۲۲ آنے جو لگے ہوا کے جھونکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
۱۲۳ سامان ملے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے گھڑی گھڑی کے
۱۲۴ دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
۱۲۵ وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں کبھی یہ گانا

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ بجلی کے لگاتار چمکنے سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی پھر ہوا کے نرم نرم جھونکے آنے لگے جس سے سفر کے سارے دکھ بھولنے لگے اور مجھے راحت محسوس ہونے لگی۔ شاعر کہتا ہے جب دل لگی کے سامان میسر آئے تو مجھے وہ مزے یاد آنے لگے جو ہم کبھی کبھی ادا کیا کرتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو گئی۔ سارے وہ لمحے وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ آپ ہی آپ گنگنایا کرتے اور جوش کے ساتھ گیت گایا کرتے یعنی حالی کو اپنا ماضی یاد آ گیا اور وہ ان حسین لمحوں کو یاد کر کے رونے لگے۔

چھبیسواں بند:

۱۲۶ اے چشمۂ آبِ زندگانی — ٹھہری نہ کبھی تیری روانی
۱۲۷ جاتی ہے جدھر تیری سواری — بہتی ہے اسی طرف ہماری
۱۲۸ پائے جو کہیں مری سبھا کو — دینا اس بیچ میں صدا کو
۱۲۹ اول کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
۱۳۰ قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمہاری آئی برکھا

تشریح: ان اشعار میں شاعر اپنے وطن کی جدائی سے پریشان لہجے میں یوں فرماتے ہیں کہ برسات کے اس حال کو دیکھ کر سارے پیکر سے جھلکتا ہے کہ زندگی کے پانی کے چشمے تو کبھی نہ رکا، تیری روانی اسی طرح چلتی جا رہی ہے جیسے ازل سے کیوں کہ زندگی کا دار و مدار پانی پر ہی ہے۔ لیکن شاعر کو اپنے عزیز وطن کی جدائی کا احساس تڑپا رہا ہے وہ بارش سے

مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے برسات تو جس طرف جا رہی ہے اسی جانب ہمارا وطن ہے اس لیے اگر تیرا گزر میری محفل میں ہو تو میری جماعت کے لوگوں کو تو میرا پیغام پہنچا دینا۔ پہلے ان کو میرا سلام کہنا اور بعد میں ان کو میری بیماری کا قصہ سنانا کہ میں لاہور میں تکلیفوں سے بھری زندگی گزار رہا ہوں اور مجھے اپنا وطن اور محفلیں یاد آ رہی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میری قسمت میں شاید یہی لکھا تھا کہ تمہاری جدائی میں برسات آئے اور ایسا ہی ہوا میں لاہور میں اپنے وطن سے دور ہوں اور میرے وطن میں برسات آئی ہوئی ہے۔

ستائیسواں بند:

۱۳۱ آتا ہے تمہارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
۱۳۲ ہم تم بھی کبھی صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جا کر
۱۳۳ جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
۱۳۴ ہم تم یوں ہی ہاتھ میں دیے ہاتھ — پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
۱۳۵ جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا

تشریح: ان اشعار میں حالی اپنے بچپن کی صحبتوں کو یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے میرے ہم وطنوں پردیس میں جب تمہارا دھیان آتا ہے تو پہلے کی طرح پانی میں مرغابیاں تیرتی نظر آتی ہیں یعنی ماضی کی تصویر آنکھوں میں ابھر آتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب میں دوستوں کے ساتھ مل کر پورا پورا دن تالاب میں تیرا کرتے تھے۔ اب جب مجھے سبزہ اور پھول لہلہاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو بچپن کے سارے مزے یاد آ جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے وہ دن بھی یاد آتے ہیں جب میں دوستوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے ادھر ادھر پھرتے ہوائیں کھاتے خوشیاں مناتے تھے۔ آم کے پیڑ سے جب کوئی آم گرتا تھا تو میں تم کو ادھر ادھر دیکھتا تھا وہ سب باتیں مجھے آج تک یاد ہیں۔ اور اب بھی میں اپنے آس پاس دیکھتا ہوں مگر کوئی نظر نہیں آتا۔

اٹھائیسواں بند:

۱۳۶ آ کر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
۱۳۷ رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار — جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار

جھول رہی ہیں۔ بارش کے موسم میں ساری لڑکیاں مل کر گا رہی ہیں ان کی آواز اتنی بلند ہے گویا سارا جنگل سر پہ اٹھا رکھا ہے۔ کوئی دوسری کو جھولا جھلا رہی ہے اور کوئی جھولے سے گرنے سے ڈر رہی ہے۔ کوئی ان میں ملاو بھی خوشی کے گیت گا رہی ہے تو کوئی دوسری کو پینگ پر چڑھا کر جھلا رہی ہے۔ غرض لڑکیاں سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

بائیسواں بند:

106 گاتی ہے کبھی کوئی بنّے والا — کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
107 اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
108 ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
109 گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی — اور تیر کے پہنچا پار کوئی
110 بگلوں کی ہیں ڈاریں آگے گرتی — مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ برسات کی آمد پر کمسن لڑکیاں خوشیوں کے نغمے گانے میں مصروف ہیں کوئی بنّے والا گا رہی ہے یعنی جھولے سے متعلق گیت گا رہی ہے تو کوئی مشہور پنجابی عشقیہ گیت بدیسی ڈھولا گانے میں مگن ہے۔ جب کوئی جھولے سے گرتی ہے تو سب اسے دیکھ کر قہقہے لگاتی ہیں اور ہنستی ہیں۔ علاوہ ازیں برسات کی وجہ سے ندی اور نالے اپنی طغیانی پر ہیں اور تیراک اسے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں یا تیرنے والوں کی ہمت بڑھ گئی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ کوئی کشتی پر سوار کر دریا پار کر رہا ہے تو کوئی تیر کے کنارے تک پہنچ رہا ہے۔ صرف انسان ہی نہیں بلکہ بگلے اور مرغابیاں بھی برسات کے پانی میں تیر کر لطف اٹھا رہے ہیں۔

تئیسواں بند:

111 چڑھے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے — دن بھر ہیں بیڑے جا کے لگتے
112 زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈراتی
113 ناویں ہیں ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
114 ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان — بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
115 منجھدھار کی رو زوروں پہ ہے — مچھلی کو بھی جان کا خطرہ ہے

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر برسات میں ندیوں کی طغیانی کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زور سے برسات ہونے کے سبب ندیوں کے کنارے وسعت اختیار کر گئے ہیں یعنی کناروں کی حدود میں اضافہ ہوا ہے۔ ندی میں چلنے والی کشتیاں بھی سیلاب کی زد میں ہیں وہ دن بھر چلنے کے بعد کہیں کنارے جا لگتی ہیں۔ برسات کی وجہ سے ہر طرف پانی چڑھا ہوا ہے یعنی پانی سیلاب کی سی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ندی کی لہروں کے بہاؤ اور طغیانی کو دیکھ کر لگتا ہے انھوں نے ڈراونی صورت اختیار کر لی ہے۔ پانی میں پڑی ہوئی کشتیاں تھپیڑے کھا رہی ہے وہ لہروں کے تھپیڑے کھا کر ادھر سے اُدھر جا رہی ہیں۔ پانی کے اس شباب اور روانی سے ملاحوں کے دل بھی ڈرے ہوئے ہیں اُن کے ہوش اڑ چکے ہیں اب اس تیز رفتار پانی میں خدا ہی کشتیوں کا نگہبان ہے ندی کے درمیان میں تو پانی کا بہاؤ اور بھی تیز ہے جس سے مچھلی کو بھی جان کا خطرہ بنا ہوا ہے۔

چوبیسواں بند:

116 بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
117 غربت کی مصیبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
118 غم خوار ہے کوئی اور نہ دلجو — اک باغ میں ہے پڑا لب جو
119 ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
120 ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر اپنے قیام لاہور کی تکلیفوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں پردیس میں بیماریوں کے سبب زخمی ہو چکا ہوں مجھے اپنی جان و تن کی بھی خبر نہیں ہے میں وطن کی صحبت سے بچھڑا ہوا بدنصیب ہوں میں غربت کی مصیبتوں کا مارا ہوا ہوں مجھ میں چلنے کا حوصلہ باقی نہیں ہے۔ جہاں وطن سے دور یعنی لاہور میں نہ کوئی میرا غم خوار ہے اور نہ کوئی دلجوئی کرنے والا میں ایک باغ کے کونے میں ندی کے کنارے اکیلا پڑا ہوا ہوں ایک تو وطن سے دوری کا احساس جان و تن کیے ہوئے ہیں دوسرا گرمی کی شدت نے جینا محال کر دیا ہے۔ ذہن میں سفر کی تکلیفیں ہیں جس کے سبب نہ اپنی خبر ہے اور نہ گھر کا پتہ۔ اتنے میں آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا ایک طرف سے اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رنگ بدل گیا اور بارش شروع ہو گئی جس کی وجہ سے گرمی سے کچھ راحت ملی ہے۔ مگر وطن کی

۹۰ امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ — اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

تشریح: ان اشعار میں خواجہ الطاف حسین حالی برسات کی جادوئی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے برسات تو نے کل ایسی آگ سنائی کہ جسے سن کر جنگل بے قرار ہو گئی رات بھر میں سارا موسم تبدیل ہو گیا یہ تو نے کیسے جادو کر دیا۔ جب سوئے تو شدید گرمی کا موسم تھا اساڑھ کا مہینہ تھا اور جب صبح جاگے تو بارش کی وجہ سے سردی کا سا سماں ہو گیا ہے۔ جب سوئے تو لاہور کے جیسے گرمی تھی اور جب آنکھ کھلی تو کشمیر کے جیسا موسم ہو چکا تھا۔ گرمی میں چلنے والی زہریلی ہواؤں میں تو نے امرت بھر دیا ہے۔ یہ ساری تبدیلی فقط ایک ہی رات میں ہو گئی ہے اور یہ سارا بارش کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا برسات کا ہے۔

انیسواں بند:

۹۱ دریا تھے بن سسک رہے تھے — اور بن تری راہ تک رہے تھے
۹۲ دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان — اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
۹۳ جن جھیلوں میں کل تھی خاک اڑتی — ملتی نہیں آج تھاہ ان کی
۹۴ جو دانے تھے خاک میں پریشان — سب آگے چڑھائے تو نے پروان
۹۵ دولت جو زمیں میں تھی چھپی — آگے ترے اس نے سب اگل دی

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ پانی کے بغیر دریا سسک رہے تھے حتیٰ سوکھے پڑے تھے لیکن برسات نے آ کر ان کو اب بھر دیا اور دریاؤں میں جان آ گئی اسی طرح جنگل میں سوکھ چکے تھے اور وہ بھی تیری راہ دیکھ رہے تھے تیری آمد سے جنگلوں کی شان اضافہ پا گئی ہے۔ وہ جھیلیں جو گرمی کی وجہ سے سوکھی پڑی تھیں اور خاک اڑ رہی تھی برسات کی وجہ سے ان میں اتنا پانی بھر گیا ہے کہ ان کی گہرائی کا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ جو بیج اور دانے خشک سالی کی وجہ سے خاک میں پریشان پڑے تھے۔ برسات کی آمد سے وہ پھوٹ پڑے اور پروان چڑھنے لگے حتیٰ برگ و بار نکلنے لگے۔ زمین کے اندر دانے اور بیج کی صورت میں جو بھی دولت پنہاں تھی وہ ساری اب باہر آنے لگی ہے زمین نے برسات کی وجہ سے اس کو گویا اگل دیا ہے۔ غرض دریا ہوں یا باغ، زمین ہو یا جنگل ہر جا سبزہ زار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ سب برسات کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

بیسواں بند:

۹۶ پڑتے تھے اڑاڑ جس زمیں پر — واں سبزہ کل میں جلوہ گستر
۹۷ جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے — باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
۹۸ جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے — واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
۹۹ تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار — ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار
۱۰۰ کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں — جھونکے ہیں کہ سو بسو چڑھے ہیں

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ کل جس زمین میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا تھا آج وہاں سبزہ ہی سبزہ ہے۔ اور طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ جو پودے کل تک خشکی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے تھے اور جب کو جانور چر لیتے تھے آج وہ بارش کی وجہ سے اونچے ہو گئے ہیں اور آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کل تک جن باغوں میں بگولے اڑتے تھے وہاں آج برسات کی برکت سے سینکڑوں جھولے پڑے ہوئے ہیں اور شاخیں پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہیں۔ کل تک جس زمین پر ریت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ریگستان کا سا سماں تھا وہاں آج گلزار مہک رہے ہیں۔ باغوں میں جگہ جگہ پھولوں اور پھلوں والی شاخوں کے نیچے ستون لگائے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ ڈالے ہوئے ہیں۔ یعنی باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں پھل تر و تازہ ہیں اور بہار اپنے جوبن پر ہے۔

اکیسواں بند:

۱۰۱ کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
۱۰۲ ہیں پھول رہی خوشی سے ساری — اور جھول رہی ہیں باری باری
۱۰۳ جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی — جنگل کو ہیں وہ سر پہ اٹھاتی
۱۰۴ اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے — اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
۱۰۵ ہے ان میں کوئی ملار گاتی — اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

تشریح: ان اشعار میں حالی فرماتے ہیں کہ کچھ لڑکیاں چھوٹی اور کم عمر ہیں جن کے ابھی کھیلنے کودنے کے دن ہیں وہ بارش میں کھیل رہی ہیں اور خوشی منا رہی ہیں۔ بارش کی وجہ سے لڑکیاں خوشی سے پھول رہی ہیں اور باری باری جھولے

پندرھواں بند:

۷۱ مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ — یا ربّنا و ما علینا
۷۲ مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری بھگو رایا
۷۳ کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
۷۴ جاتا ہے کوئی ملار گاتا — ہے دیس میں کوئی گنگناتا
۷۵ جوگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے — اور بانسریاں بجاتے پھرتے

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ برسات میں ہر شخص پروردگار کا شکر بجا لا رہا ہے۔ مسجد میں اہلِ تقویٰ یعنی پرہیزگار "یا ربنا و ما علینا" کا ورد کر رہے ہیں یعنی اے میرے خدا تو ہمارے لئے بہتر ہے وہ ہمیں عطا کر۔ کچھ مندروں میں مقصود راجا یعنی جال دیوتا کی ارادھنا کر کے اس کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ سکھ دھرم کے لوگ اور کبیر پنتھی اپنے عقیدے کے مطابق بھجن گا کر اپنے گرو کی عبادت کر رہے ہیں۔ برسات کے اس موقع پر کوئی ملار راگ گا رہا ہے تو کوئی دیس بھگتی کے گیت گنگنا رہا ہے۔ جوگی بھی نشے میں جھوم رہے ہیں اور بانسریاں بجا رہے ہیں۔ غرض ہر کوئی اپنے اپنے طریقے سے برسات کی خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔

سولھواں بند:

۷۶ سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
۷۷ رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے — ڈھلکے ہیں دیوں پہ ڈھلکتے پھرتے
۷۸ کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھیا — تا جل نہ سکے کوئی پتنگا
۷۹ ہیں شکر گزار تیرے برسات — انسان سے لے کر جمادات
۸۰ دنیا میں بہت تھی چاہ تیری — سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ برسات کی خوشی کے اظہار میں کوئی سرون کا قصہ گا کر سنا رہا ہے تو کوئی ہیر رانجھا کی داستانِ محبت گا رہا ہے۔ جین مت کو ماننے والے اپنے منہ پر پٹی باندھ کر پھر رہے ہیں تا کہ کوئی جاندار منہ میں جا کر لقمۂ اجل نہ بن جائے۔ انسان سے لے کر جمادات تک ہر کوئی برسات کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ شاعر فرماتا ہے

کہ اے برسات دنیا میں سب تیری چاہت میں تیرا انتظار کر رہے تھے سب تیری راہ دیکھ رہے تھے۔ گویا سب تیری آمد کے منتظر تھے۔

سترھواں بند:

۸۱ تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت — راحت ملتی ہے بعدِ کلفت
۸۲ شکریہ فیضِ عام تیرا — پیشانی دہر پہ ہے لکھا
۸۳ گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
۸۴ طاؤس کو ناچنا بتایا — کوئل کو الاپنا سکھایا
۸۵ جب مور ہے ناچنے پہ آتا — آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر برسات کی برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے برسات تجھ سے قدرت کا یہ راز ہم پر عیاں ہو گیا ہے کہ ہر مشکل کے بعد راحت کے دن آتے ہیں اور ہر غم کے بعد خوشی کا موسم آتا ہے۔ اگرچہ گرمی کا موسم مشکلات بھرا تھا تاہم برسات کی آمد سے ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ اب برسات کا فیضِ عام جاری ہے ہر چیز اس کے فیض سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ اور ہر کوئی برسات کے فیضِ عام کا شکر گزار ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے برسات تو نے باغ کو خوبصورتی عطا کر دی ہے اور کھیتی کو خوشحال اور ہرا بھرا بنا دیا ہے۔ تو نے مور کو ناچنا بتایا یعنی مور خوشی سے ناچ رہے ہیں اور کوئل خوشی کے نغمے گا رہی ہے۔ برسات میں جب مور ناچتا ہے تو ناچتے ناچتے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اس وقت مور کا ناچ بڑا حسین اور خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ غرض ہر کوئی خوشی کے مارے جھوم رہا ہے اور برسات کی آمد کا جشن منا رہا ہے۔

اٹھارھواں بند:

۸۶ کوئل کو نہیں قرار اک پل — ایسی کوئی تو نے کوک دی کل
۸۷ شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں — کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں
۸۸ سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا — اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
۸۹ لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن — کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ آسمان پر بادلوں کے رنگ برنگے دستے رواں ہیں کچھ گورے اور کچھ کالے دکھائی دیتے ہیں اور کچھ کالے۔ آسمان ایک چھاؤنی کی صورت اختیار کر گیا ہے اور وہاں بادلوں کی فوج نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ ایک فوج آتی ہے تو دوسری جاتی ہے۔ بادل اپنی پوری طاقت اور گرج کے ساتھ امڈے ہیں انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے فوج اپنے ساتھ اسلحہ اور توپ خانے لے کر کسی مہم پر جا رہی ہو۔ بادلوں کی گرج سے زمین اندر سے ہل جاتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے بھاری بھاری توپیں چل رہی ہوں۔ گرج چمک کے ساتھ اب بادل خوب برس رہے ہیں تمام زمین پر پانی ہی پانی ہو گیا ہے جس نے گرمی کے زور کو توڑ دیا ہے گویا گرمی ختم ہو گئی ہے۔

بارھواں بند:

۵۶	بجلی ہے جو کبھی کوند جاتی	آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
۵۷	گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں	جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
۵۸	کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی	قدرت ہے نظر خدا کی آتی
۵۹	سورج نے نقاب لی ہے منھ پر	اور دھوپ نے تہ کیا بستر
۶۰	باغوں نے کیا غسل صحت	کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ چاروں اور کالا اندھیرا چھایا ہوا ہے جب بھی آسمان پر بجلی کوند جاتی ہے تو اس کی روشنی سیدھی آنکھوں میں پڑتی ہے۔ ہر طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے جنت کی ہوائیں چل رہی ہوں۔ جہاں تک بھی نظر جا رہی ہے وہاں قدرت کے حسین منظر ہی نظر آ رہے ہیں۔ سورج نے اپنے منھ پر نقاب ڈال لی ہے اور دھوپ نے بھی اپنا بستر بند کر لیا ہے۔ باغ بھی نہا دھو کر تر و تازہ ہو گئے ہیں اور کھیتوں نے بھی سبز لباس پہن لیا ہے۔ غرض بارش کے آنے سے ہر طرف ہریالی اور خوشی کا موسم ہے۔

تیرھواں بند:

۶۱	بنتا ہے مینہ سے سڑک ہموار	انگلی سے ہیں راہ چلتے رہوار
۶۲	ہے سنگ و شجر کی ایک وردی	عالم ہے تمام لاجوردی
۶۳	پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار	دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

۶۴	پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل	ہے گونج رہا تمام جنگل
۶۵	کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو	اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر برسات کی آمد اور اس کے اثرات واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ بارش کی وجہ سے سڑک اور راستہ پانی سے بھر گیا ہے۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا راستے چلنے والے اندازے سے چلتے ہیں۔ پتھر اور پہاڑ نے ایک ہی رنگ یعنی ہرے رنگ کی وردی پہن لی ہے ساری دنیا نیلے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ پہاڑ پھولوں سے لدے ہوئے ہیں درخت بھی سج سنور کر دولہے بنے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف پانی بھرا ہوا ہے اور تمام جنگل گونج رہا ہے۔ تمام پرندے خوشی کے ترانے گا رہے ہیں۔ پپیہا چاروں طرف پیہو پیہو کر رہا ہے اور مور بھی چنگھاڑتے پھر رہے ہیں۔ یعنی خوشی میں آ کر ناچ رہے ہیں۔ گویا ہر شے جوبن پر ہے اور چاروں طرف خوشی کی بہاریں ہیں۔

چودھواں بند:

۶۶	کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی	گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
۶۷	مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے	سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
۶۸	سب خوان کرم سے حق کے ہیں سیر	پانی میں مگر، کچھار میں شیر
۶۹	زردار ہیں اپنے مال میں مست	قلاش ہیں اپنی کھال میں مست
۷۰	ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر	نغمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

تشریح: ان اشعار میں شاعر برسات کے موسم کی رنگینی بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کوئل جیسی کوک کانوں میں رس گھولتی ہے اور دل کو بھاتی ہے۔ کوئل کی کوک اتنی میٹھی اور سریلی ہے کہ دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ پانی میں مینڈک اتنی زور زور سے بول رہے ہیں کہ ساری دنیا سر پہ اٹھا رکھی ہے۔ ساری چرند اور پرند خدا کی نعمتوں سے سیر ہو رہا ہے۔ مگر مچھ پانی میں شیر کچھار میں قدرت کے فیض سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ دنیا کے سارے لوگ اپنے اپنے حال میں مست ہیں امیر اور مالدار اپنی دنیا میں مست ہیں اور غریب و مفلس اپنے حال میں مگن۔ برسات کی آمد سے ہر کسی کی زبان پر خوشی کے نغمے ہیں۔ ہر کوئی برسات کے موسم میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

منہ میں پانی بھر آتا تھا۔

آٹھواں بند:

۳۶	تھے جو خفقانی اور مراقی	گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
۳۷	کھانے کا نہ تھا انہیں مزہ کچھ	آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
۳۸	بن کھائے کئی کئی دن اکثر	رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
۳۹	شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے	ہر پیٹ کے پیچ تھے بگڑتے
۴۰	اور صبح سے شام تک برابر	تھا العطش العطش زبان پر

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر گرمی کی حدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو لوگ دل کی بیماری اور دماغ کی بیماری کے مریض تھے وہ گرمی سے بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ گرمی کے سبب کھانا کھانے کا کوئی مزا نہیں تھا آٹھ آٹھ پہر تک بھوک ہی نہیں لگتی تھی۔ کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے گزر جاتے تھے اور فقط ٹھنڈائیوں پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ گرمی کی وجہ سے ساری رات ایڑیاں رگڑتے گزر رہی تھی صبح کو کہیں تھوڑا سا آرام ملتا تھا لیکن سورج نکلتے ہی گرمی شدت اختیار کر جاتی تھی اور پھر صبح سے لے کر شام تک گرمی کے مارے ہر کسی کی زبان پر "پانی پانی" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اور وہ پیاس کی دہائی دیتا رہتا تھا۔

نواں بند:

۴۱	بچوں کا ہوا تھا حال بے حال	کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
۴۲	آنکھوں میں تھا ان کے پیاس سے دم	تھے پانی کو دیکھ کرتے "مم مم"
۴۳	ہر بار پکارتے تھے ماں کو	ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زبان کو
۴۴	پانی دیا گر کسی نے لا کر	پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر
۴۵	بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر	تھا حال بڑوں کا ان سے بدتر

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے بچے بے حال ہو چکے تھے اور ان کے پھول جیسے نازک گال مرجھائے ہوئے تھے۔ پیاس کی شدت سے بچے پریشان تھے اور پانی کو دیکھ کر "مم مم" کرتے تھے۔

بچے پیاس کے مارے ماں کو پکار رہے تھے اور گرمی سے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں نم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر بچوں کو کوئی پانی لا کر دیتا تو وہ پانی کا برتن منہ سے الگ نہیں کرتے۔ صرف بچے ہی پیاس سے بے حال نہیں تھے بلکہ بڑے بھی پیاس کے مارے نڈھال ہو رہے تھے۔

دسواں بند:

۴۶	تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری	پانی سے نہ تھی کسی کو سیری
۴۷	کل شام تلک تو تھے یہی طور	پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
۴۸	پُروا کی دہائی پھر رہی ہے	پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
۴۹	برسات کا بج رہا ہے ڈنکا	اک شور ہے آسماں پہ برپا
۵۰	ہے ابر کی فوج آگے آگے	اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

تشریح: شاعر فرماتے ہیں کہ گرمی کی شدت سے سب کی حالت کچھ ایسی تھی چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز نہیں تھا پانی سے کسی کو بھی سیری نہیں ہوتی تھی یعنی پانی سے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ کل شام تک گرمی کا یہی طور تھا لیکن رات سے موسم نے مزاج بدلا ہے اور سماں کچھ اور ہی ہے۔ بادِ مشرق چل رہی ہے جو بارش کی آمد کا سبب ہے۔ مغرب سے بھی ویسی ہی ہوا چل پڑی ہے جو بارش لانے کا پیش خیمہ ہے۔ اب برسات کا ڈنکا بج رہا ہے بادل چھا رہے ہیں گرج رہے ہیں اور بتا رہے ہیں آسمان پر بارش ہونے کا ایک عجیب شور برپا ہے۔ آگے آگے بادلوں کی فوج چل رہی ہے اور پیچھے پیچھے ہوا کا لشکر اس کو آگے دھکیل رہا ہے اور ہر طرف بارش ہی بارش ہو رہی ہے۔

گیارھواں بند:

۵۱	ہیں رنگ برنگ کے رسالے	گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
۵۲	ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی	اک آتی ہے فوج ایک جاتی
۵۳	جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے	ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
۵۴	توپوں کی ہے جب کہ باڑ چھٹتی	چھاتی ہے زمین کی دہلتی
۵۵	مینہ کا ہے زمین پہ دونگڑا	گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

اور دانہ کھانا چھوڑ دیا تھا پیاس کے مارے اُن کا دم نکلا جا رہا تھا۔ گرمی نے چاروں اور آگ سی لگا رکھی تھی اور سب کا سانس نکلا جا رہا تھا یعنی سانس پھول رہا تھا۔ لو کی آندھیاں اور طوفان برپا تھے اور بگولے پر بگولا اُٹھ رہا تھا۔ گرمی کی شدت کا حال ایسا تھا کہ زمین بھی شعلے اُگل رہی تھی اور انسانوں کے جسم پر گویا لو کے آرے چل رہے تھے۔ ہوا آگ کا کام کر رہی تھی اور آگ یوں ہی صفت میں بدنام تھی۔ یعنی ہوا میں نمی کی جگہ تپش تھی اور وہ آگ کی طرح گرمی کا احساس دلا رہی تھی۔

پانچواں بند:

۴۱	رستوں میں سوار اور پیدل	سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بیکل
۴۲	گھوڑے کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں	ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
۴۳	تھی سب کی نگہ سوئے افلاک	پانی کی جگہ برستی تھی خاک
۴۴	پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی	وہ باد سموم سے سوا تھی
۴۵	بجھتی نہ تھی آتشِ درونی	لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے گرمی کے سبب پیدا ہونے والی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ گرمی کی شدت سے راستوں میں چلنے والے سوار اور پیدل سب دھوپ کی گرمی اور لو کے سبب پریشان اور بے حال ہوئے جا رہے ہیں راستے میں اگر کہیں درخت کا سایہ نظر آ جاتا تو گھوڑے گرمی سے بچنے کے لئے درخت کے نیچے جا کھڑے ہو جاتے۔ گرمی نے سب کا جینا محال کر رکھا تھا سب کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں کہ کہیں بارش ہو اور پانی برسے مگر بجائے پانی کے آگ برس رہی تھی۔ پنکھے بھی بجائے ٹھنڈی ہوا کے لو برسانے کا کام کر رہے تھے۔ ہوا سے بدن کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے دوگنی آگ کا احساس ہوتا تھا۔ غرض چاروں اور آگ برس رہی تھی اور لو چل رہی تھی اور اس نے تمام ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

چھٹا بند:

۴۶	سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک	جانداروں پہ دھوپ کی تھی دہشت
۴۷	ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی	تہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی

۲۸	بازار پڑے تھے سارے سنسان	آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
۲۹	چلتی تھی دکان جن کی دن رات	بیٹھے تھے وہ ہاتھ پہ دھرے ہاتھ
۳۰	خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا	یا چاہ یا سبیل پر تھا

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ گرمی کی تپش اور حدت سے ہر جاندار بے حال تھا گرمی سے بچنے کے لئے کوئی چھپر میں دن گذارتا ہے تو کوئی تہ خانے میں پناہ لیتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے انسان کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا اور سارے بازار بے رونق اور سنسان پڑے تھے۔ بازار میں جن کی دکانیں دن رات کھلی رہتی تھیں اور لوگ خرید وغیرہ کرتے تھے وہ دکاندار بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھے تھے کیونکہ گرمی کے سبب کوئی باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ شہر کی ہر گلی اور بازار سنسان تھا صرف پانی کے چشموں پر بھیڑ جمع تھی لوگ گرمی کی حدت کو کم کرنے کے لئے پانی کا سہارا لے رہے تھے۔ غرض چاہ اور سبیل پر لوگوں کا ہجوم اُمڈ پڑا تھا۔

ساتواں بند:

۳۱	تھا شہر میں قحط آدمی زاد	سلطان کا اک کنواں تھا آباد
۳۲	پانی سے تھی سب کی زندگانی	میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی
۳۳	تھیں برف پہ نیتیں ٹپکتی	فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
۳۴	پھل پھول کی دیکھ کر طراوت	پاتے تھے دل و جگر طراوت
۳۵	کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی	بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں شاعر فرماتے ہیں کہ گرمی کی حدت سے شہر میں لوگوں کا قحط پڑا ہوا تھا شہر سنسان تھے البتہ شہر لاہور میں سلطان کا ایک کنواں تھا جو ٹھنڈے پانی کی وجہ سے مشہور تھا پیاس بجھانے کی غرض سے لوگ اسی کنوئیں پر جمع ہوتے تھے۔ گرمی کے موسم میں پانی ہی زندگی بخشنے کا ذریعہ تھا اس لئے پانی کے آس پاس لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ برف کو دیکھ کر لوگوں کی نیت پھسل جاتی تھی اور فالودے کو دیکھ کر منہ میں پانی آ جاتا تھا۔ پھلوں اور پھولوں کی تازگی اور ٹھنڈک سے انسانوں کے دل و جگر بھی ٹھنڈک محسوس کرتے تھے۔ پھل اور سبزی فروشوں کی طرح طرح کی بولیاں سن کر

تشریح: مذکورہ بند خواجہ الطاف حسین حالی کی مشہور نظم "برکھا رت" سے ماخوذ ہے۔ حالی کا شمار جدید اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا تصور پیش کیا۔ ان کی یہ نظم اپنی نوعیت کی بے نظیر نظم ہے۔ اس نظم کو حالی نے 1874ء میں لکھا اور 'انجمن پنجاب' کے جلسے میں پڑھا تھا۔ ان کی دیگر اہم نظموں میں 'حب وطن'، 'نشاطِ امید'، 'مناظرہ رحم و انصاف'، 'مناجات بیوہ'، 'دولت اور وقت کا مناظرہ'، اور 'مسدس مدوجزر اسلام' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مذکورہ اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ برسات گرمی کی تپش کو بجھانے والی اور سردی کے موسم کا پیغام لانے والی ہوتی ہے۔ یعنی جب برسات ہوتی ہے تو گرمی ختم ہو جاتی ہے اور موسم خنک ہو جاتا ہے۔ برسات گویا قدرت کے عجائبات کی کان ہے اور عارف کے لئے معرفت کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ برسات کے آتے ہی درختوں کی شاخوں پر جوانی آ جاتی ہے اور مور اور مینڈکی کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ گویا برسات شاخوں، موروں اور مینڈکیوں کے لئے باعث زندگانی ہے۔ برسات پورے سال کی جان ہے اور خدا کی قدرت کی شان ہے۔ یہ سینکڑوں دعاؤں اور التجاؤں کے بعد آئی ہے کیونکہ گرمی کی تپش سے بچنے کے لئے لوگوں نے برسات کی دعائیں مانگیں اور وہ قبول ہو گئیں۔ اور بارش ہو گئی۔

دوسرا بند

۶ وہ آئی تو آئی جان میں جان — سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
۷ گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
۸ بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا — اور کھول رہا تھا آب دریا
۹ تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں — اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
۱۰ سانپ تھے بلوں میں منہ چھپائے — اور ہانپ رہے تھے چارپائے

تشریح: ان اشعار میں شاعر فرماتا ہے کہ برسات کے آنے سے سب کے اندر جان آگئی ہے ورنہ گرمی کے مارے سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ اگر برسات نہ آتی تو سب چند دنوں کے مہمان تھے۔ گرمی کی شدت سے سارے جاندار تڑپ رہے تھے اور پہاڑ بھی گرمی کی تپش سے تپ رہے تھے۔ صحرا کی ریت آگ سے بھی زیادہ گرم ہو رہی تھی اور دریا کا پانی بھی ابل رہا تھا۔ تیز دھوپ کے سبب چمن کے پھول مرجھا گئے اور شاخیں اس قدر ویران تھیں جیسے کسی نے لوٹ مچا رکھا

ہوا اور گرمی سے جنگل میں چاروں اور آگ سی لگی ہوئی تھی۔ مارے گرمی کی شدت سے سانپ بلوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے اور چارپائے یعنی جانور زبان نکالے ہانپ رہے تھے۔ گرمی کی شدت سے ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

تیسرا بند

۱۱ تھیں لومڑیاں زبان نکالے — اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
۱۲ چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ — ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
۱۳ تھے شیر پڑے کچھار میں سست — گھڑیال تھے رود بار میں سست
۱۴ ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا — بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
۱۵ بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں — اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

تشریح: مندرجہ بالا اشعار میں حالی فرماتے ہیں کہ گرمی کی شدت سے لومڑیوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں اور ہرن لو لگنے سے کالے پڑ چکے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے چیتوں کو شکار کرنے کی ہوش نہیں ہے اور ہرن بھی قطاروں میں دوڑنا بھول چکے ہیں۔ گرمی کے سبب شیر کچھار میں سست پڑے ہوئے ہیں اور مگرمچھ بھی پانی کی تہہ میں بیٹھے سست رہے تھے۔ گرمی کے مارے چوپایوں کا حال بھی پتلا ہو چکا تھا اور بیلوں نے بھی اپنے کندھے ڈال دیے تھے یعنی سر جھکا لیے تھے۔ بھینسوں کے بدن کا لہو بھی ختم ہو چکا تھا اور گایوں کے تھنوں میں دودھ بھی سوکھ چکا تھا۔ غرض گرمی نے سب کو بے حال کر رکھا تھا۔

چوتھا بند:

۱۶ گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ — تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ
۱۷ گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — اور عطر نکل رہا تھا سب کا
۱۸ طوفان تھے آندھیوں کے برپا — اٹھتا تھا بگولے پہ بگولا
۱۹ آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے — شعلے تھے زمیں سے نکلتے
۲۰ تھی آگ کا دے رہی ہوا کام — تھا آگ کا نام مفت بدنام

تشریح: مذکورہ اشعار میں شاعر گرمی کی شدت کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ گرمی کی وجہ سے گھوڑوں نے گھاس

۱۳۷	رُت آم کی آئے اور نہ جھولیں یار	جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار
۱۳۸	تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی	چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
۱۳۹	ہے سرد ہوا بدن کو لگتی	پر دل میں ہے آگ سے سلگتی
۱۴۰	پردیس میں جی ہے کیا ہو شاد	جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
۱۴۱	نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی	فریاد یہ درد ناک اس کی
۱۴۲	تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز	پکڑا دل سن کے اس کی آواز
۱۴۳	حیرت رہی دیر تک کہ آخر	روتا ہے کہاں کا یہ مسافر
۱۴۴	پھر غور سے اک نظر جو ڈالی	نکلا وہ ہمارا دوست حالیؔ

☆☆☆

نظم "برکھارت" کی تشریح

تعارف: "برکھارت" حالیؔ کی ایک مشہور نظم ہے یہ نظم انھوں نے ۱۸۷۴ء میں اُس نئے طرز کے مشاعرے کے لئے لکھی تھی جس کی بنیاد محمد حسین آزاد کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس نظم میں حالی نے بڑے دلچسپ انداز سے نظم کے آغاز میں گرمی کی شدت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً "بن میں آگ کا لگنا"، "موریوں کا زبان نکالنا"، اور "زمین سے شعلوں کا نکلنا" یہ سب گرمی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ گرمی اپنے عروج پر ہے اور لوگوں کی زبانیں العطش العطش کرتے کرتے سوکھ رہی ہیں اچانک آسمان پر بادلوں نے ڈیرہ ڈالا بادلوں کے آتے ہی دھوپ نے اپنا بستر اکٹھا کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں جل تھل بھر گیا۔ نظم "برکھارت" منظر نگاری کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ حالیؔ کے انداز بیان سے ان کی قوت مشاہدہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نظم کو پڑھتے وقت یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر برسات کے موسم سے متاثر ہے۔ ان کی خوبصورت اور دل کش تشبیہات نے نظم میں اور بھی حسن پیدا کر دیا ہے۔ حالیؔ کی مخصوص سادگی اور واقعیت نگاری کے بیان میں اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ نظم کی طوالت ناگوار ہونے لگتی ہے جس سے نظم کی دل کشی مجروح ہو جاتی ہے۔ بہر طور مجموعی طور پر حالیؔ کی یہ نظم برسات پر لکھی گئی عمدہ نظم ہے جو عوام سے نزدیک اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔

پہلا بند:

1	گرمی کی تپش بجھانے والی	سردی کا پیام لانے والی
۲	قدرت کے عجائبات کی کان	عارف کے لئے کتاب عرفان
۳	وہ شاخ و درخت کی جوانی	وہ مور و ملخ کی زندگانی
۴	وہ سارے برس کی جان برسات	وہ کون؟ خدا کی شان برسات
5	آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد	اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

حوالہ: تشریح طلب بند شاملِ نصاب شاعر الطاف حسین حالی کی نظم "برکھارت" سے لیا گیا ہے۔

۹۶ پڑتے تھے ڈالا جس زمیں پہ — وہاں سبزہ و گل میں جلوہ گستر
۹۷ جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے — باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
۹۸ جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے — وہاں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
۹۹ تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار — ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار
۱۰۰ کھمب باغوں میں جا بجا گڑے ہیں — جھولے ہیں کہ سو بسو پڑے ہیں
۱۰۱ کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کودنے کے دن
۱۰۲ ہیں جھول رہی خوشی سے ساری — اور جھول رہی ہیں باری باری
۱۰۳ جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی — جنگل کو ہیں وہ سر پہ اٹھاتی
۱۰۴ اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے — اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
۱۰۵ ہے ان میں کوئی ملار گاتی — اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
۱۰۶ گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا — کہتی ہے کوئی بدلی اکھولا
۱۰۷ اک جھولے سے دوسری پہ جا کر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
۱۰۸ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
۱۰۹ گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی — اور تیر کے پہنچا پار کوئی
۱۱۰ بگلوں کی ہیں ڈاریں آگے گرتی — مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
۱۱۱ چھلکے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے — دن بھر ہیں بڑے جہاں کے تکتے
۱۱۲ زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈراتی
۱۱۳ ناویں ہیں ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
۱۱۴ ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان — بجرے کا خدا ہی ہے نگہبان
۱۱۵ منجدھار کی رو زوروں پہ ہے — مچھلی کو بھی جان کا خطرہ ہے

۱۱۶ بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
۱۱۷ غربت کی مصیبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
۱۱۸ غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اک باغ میں ہے پڑا لب جو
۱۱۹ ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
۱۲۰ ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
۱۲۱ برق اگنے لگی تڑپ پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم
۱۲۲ آنے جو لگے ہوا کے جھونکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
۱۲۳ سامان لے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے کبھو کبھی کے
۱۲۴ دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
۱۲۵ وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں کبھی یہ گانا
۱۲۶ اے چشمۂ آب زندگانی — مشہور بھی تیری روانی
۱۲۷ جاتی ہے جدھر تیری سواری — بہتی ہے اسی طرف ہماری
۱۲۸ پائے جو کہیں مرے سجنا کو — دیتا ہوں قسم تجھے خدا کو
۱۲۹ اول کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
۱۳۰ قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمہاری آئی برکھا
۱۳۱ آتا ہے تمہارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
۱۳۲ ہم تم یونہی صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جا کر
۱۳۳ جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
۱۳۴ ہم تم لیں ہی ہاتھ میں دیے ہاتھ — پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
۱۳۵ جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو ادھر ادھر ہوں تکتا
۱۳۶ آ کر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو

۵۴ توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی   چھاتی ہے زمیں کی دہلتی

۵۵ مینہ کا ہے زمیں پہ دونگڑا   گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

۵۶ بجلی ہے جو کبھی کوند جاتی   آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

۵۷ گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں   جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

۵۸ کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی   قدرت ہے نظر خدا کی آتی

۵۹ سورج نے نقاب لی ہے منہ پر   اور دھوپ تہہ کیا بستر

۶۰ باغوں نے کیا غسل صحت   کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

۶۱ جیتا ہے نہ ہے سڑک نمودار   اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

۶۲ ہے سنگ و شجر کی ایک وردی   عالم ہے تمام لاجوردی

۶۳ پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار   دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

۶۴ پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل   ہے گونج رہا تمام جنگل

۶۵ کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو   اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

۶۶ کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی   گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی

۶۷ مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے   سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

۶۸ سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر   پانی میں مگر، کچھار میں شیر

۶۹ دردار ہیں اپنے حال میں مست   قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست

۷۰ ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر   کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

۷۱ مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ   یا رب لنا و ما علینا

۷۲ مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا   کرپا ہوئی تیری میگھ راجا

۷۳ کرتے ہیں گرو گرو گرستی   گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی

۷۴ جاتا ہے کوئی ملار گاتا   ہے دیس میں کوئی گنگناتا

۷۵ جنگل ہیں نشے میں گاتے پھرتے   اور بانسریاں بجاتے پھرتے

۷۶ سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا   بچھڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

۷۷ رکھشک جو بنے ہیں بین مت کے   ڈھلتے ہیں دیوں پہ ڈھنکتے پھرتے

۷۸ کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھیا   تا حل نہ بچے کوئی پتنگا

۷۹ ہیں شکر گزار تیرے برسات   انسان سے لے کے تا جمادات

۸۰ دنیا میں بہت تھی چاہ تیری   سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

۸۱ تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت   راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

۸۲ شکر ہے فیض عام تیرا   پیشانی دہر پہ ہے لکھا

۸۳ گلشن کو دیا جمال تو نے   کھیتی کو کیا نہال تو نے

۸۴ طاؤس کو ناچنا بتایا   کوئل کو الاپنا سکھایا

۸۵ جب مور ہے ناچنے پہ آتا   آپے سے ہے اپنے گذرا جاتا

۸۶ کوئل کو نہیں قرار اک پل   ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

۸۷ شب ہجر میں ہوا سماں دگرگوں   کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں

۸۸ سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا   اٹھے تو سماں ہے ماگھ کا سا

۸۹ لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن   کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

۹۰ امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ   اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

۹۱ دریا تجھ بن سسک رہے تھے   اور بن تری راہ تک رہے تھے

۹۲ دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان   اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

۹۳ جن جھیلوں میں کل تھی خاک اڑتی   ملتی نہیں آج تھاہ ان کی

۹۴ جو دانے تھے خاک میں پریشان   سب آ کے چڑھائے تو نے پروان

۹۵ دولت جو زمیں میں تھی مخفی   آگے ترے اس نے سب اگل دی

۱۲ چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ — ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
۱۳ تھے شیر پڑے کچھار میں سُست — گھڑیال تھے رود بار میں سُست
۱۴ ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا — بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
۱۵ بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں — اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
۱۶ گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ — تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ
۱۷ گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — اور انس نکل رہا تھا سب کا
۱۸ طوفان تھے آندھیوں کے برپا — اٹھتا تھا بگولے پہ بگولا
۱۹ آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے — شعلے تھے زمین سے نکلتے
۲۰ تھی آگ کا دے رہی ہوا کام — تھا آگ کا نام مفت بدنام
۲۱ رستوں میں سوار اور پیدل — سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بیکل
۲۲ گھوڑے کے نہ آگے اٹھتے تھے پاؤں — ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
۲۳ تھی سب کی نگہ سوئے افلاک — پانی کی جگہ برستی تھی خاک
۲۴ پچھلے سے لگی جو ہوا تھی — وہ باد سموم سے سوا تھی
۲۵ بجھتی نہ تھی آتش درونی — لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
۲۶ سات آٹھ بجے سے دن ڈھلے تک — جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
۲۷ بستی میں تھا دن گنواتا کوئی — تہ خانے میں منھ چھپاتا کوئی
۲۸ بازار پڑے تھے سارے سنسان — آتی تھی نظر نہ شکل انسان
۲۹ چلتی تھی دکان جن کی دن رات — بیٹھے تھے وہ ہاتھ پہ دھرے ہاتھ
۳۰ خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا — یا پیاؤ یا سبیل پہ تھا
۳۱ تھا شہر میں قحط آدمی زاد — سلطان کا اک کنواں تھا آباد
۳۲ پانی سے تھی سب کی زندگانی — میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی

۳۳ تھیں برف پہ نعمتیں بکتی — فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
۳۴ پھل پھول کی دیکھ کر طراوت — پاتے تھے دل و جگر طراوت
۳۵ کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی — بھر آتا تھا سن کے منھ میں پانی
۳۶ تھے جو خفقانی اور مراقی — گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
۳۷ کھانے کا نہ تھا انھیں مزہ کچھ — آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
۳۸ بن کھائے کئی کئی دن اکثر — رہتے تھے فقط فضائیوں پر
۳۹ شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے — ہر بیت کے بیچ تھے پکڑتے
۴۰ اور صبح سے شام تک برابر — تھا العطش العطش زبان پر
۴۱ بچوں کا ہوا تھا حال بے حال — کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
۴۲ آنکھوں میں تھا ان کے پیاس سے دم — تھے پانی کو دیکھ کرتے "مم مم"
۴۳ ہر بار پکارتے تھے ماں کو — ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زبان کو
۴۴ پانی دیا گر کسی نے لا کر — پھر چھوڑتے تھے نہ منھ لگا کر
۴۵ بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر — تھا حال بڑوں کا ان سے بدتر
۴۶ تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری — پانی سے نہ تھی کسی کو سیری
۴۷ کل شام تک تو تھے یہی طور — پُروائے سے ہے حال ہی کچھ اور
۴۸ پُروا کی دہائی پھر رہی ہے — پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
۴۹ برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
۵۰ ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
۵۱ ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
۵۲ ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی — اک آتی ہے فوج ایک جاتی
۵۳ جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

خاندانی سید پر کر فخر کرنے لگے۔ بہت کیا تو کچھ نوحے اور سوز خوانی (نوحہ اور سوز خوانی محرم یا دوسرے دنوں کی مجالس عزا میں مرثیہ پڑھنے کے دو طریقے ہیں) سیکھ لی یا کسی کی تعریف یا مدح میں یا خود اپنے بزرگوں کی تعریف میں خوبصورت قصیدے کہہ لیے۔ بہت ہوا تو کچھ مقبروں اور آستانوں کے خادم بن کر نذر مانگ کر کھانے لگے۔ یہی سب ہمارا شیوہ ہے اور اسی پر ہم مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہ اپنے بزرگوں کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔

☆☆☆

مشق:

۱۔ نصاب میں شامل مدوجزر اسلام کے تمام بندوں میں سے بقیہ چودہ بندوں کی بھی تشریح کیجیے۔

۲۔ مشکل الفاظ کے معنی کسی مستند لغت سے معلوم کیجیے۔

سوالات:

۱۔ مدوجزر اسلام کو مسدس حالی کیوں کہتے ہیں؟

۲۔ مدوجزر اسلام میں حالی نے کیا چیز پیش کی ہے؟

۳۔ اس نظم کو لکھنے سے حالی کا کیا مقصد تھا؟

۴۔ اس طویل نظم کی فنی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۵۔ نعت نظم کی کس صنف کو کہتے ہیں؟ اس میں کتنا حصہ نعت کا ہے؟

☆☆☆

اکائی:۴

خواجہ الطاف حسین حالی

نظم "برکھا رُت"

۱ گرمی کی تپش بجھانے والی   سردی کا پیام لانے والی
۲ قدرت کے عجائبات کی کان   عارف کے لیے کتاب عرفان
۳ وہ شاخ و درخت کی جوانی   وہ سبزہ و مبلغ کی زندگانی
۴ وہ سارے برس کی جان برسات   وہ کون؟ خدا کی شان برسات
۵ آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد   اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
۶ وہ آئی تو آئی جان میں جان   سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
۷ گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار   اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
۸ بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا   اور کھول رہا تھا آب دریا
۹ تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں   اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
۱۰ سانپ تھے بلوں میں منہ چھپائے   اور ناپ رہے تھے چار پائے
۱۱ تھیں لومڑیاں زبان نکالے   اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے

تشریح: اور ہم وہ ہیں کہ ہماری ہر اک بات میں کمینہ پن جھلکتا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ گرے ہوئے لوگوں اور کمینوں سے بھی بُرا ہمارا چلن اور ہماری عادتیں ہیں۔ ہمارے سبب سے ہمارے بزرگوں کے روشن نام کو گہن لگ گیا ہے۔ یعنی ہمارے سبب اہل وطن بھی بے عزت ہو رہے ہیں گویا ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کی عزت مٹی میں ملا دی اور ہمارے چلن ہی کے سبب وہ اپنے پیارے بزرگ جن کے اخلاق کی بلندی اور جن کی شرافت اور عزت ہماری ہی وجہ سے ڈوب گئی۔

تیرہواں بند:

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں — ہزار اُن میں خوبی ہیں، تو وہ بے نوا ہیں
یہاں لاکھ میں دو اگر اغنیا ہیں — تو سو نیم بسمل ہیں، باقی گدا ہیں
ذرا کام غیرت کو فرمائیں گر ہم
تو سمجھیں کہ ہیں مبتذل کس قدر ہم

تشریح: ہمارے سوا یہاں ہندوستان میں جتنی بھی قومیں ہیں اگر ان میں ہزار خوش حال ہیں تو مشکل سے دو آدمی غریب ہوں گے اور ہمارا یہ حال ہے کہ دو لاکھ میں شاید ہی دو آدمی خوش حال اور مالدار ہوں۔ اگر دو مالدار ہوں گے تو سو نیم بسمل یعنی پریشان حال ہوں گے اور باقی فقیروں کی حیثیت میں ہوں گے۔ اگر ذرہ برابر بھی ہم غیرت کو کام میں لائیں تو سمجھ میں آ جائے گا کہ کس قدر پست و ذلیل و خوار ہیں۔

چودھواں بند:

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں — ہزار اُن میں خوبی ہیں، تو وہ بے نوا ہیں
یہاں لاکھ میں دو اگر اغنیا ہیں — تو سو نیم بسمل ہیں، باقی گدا ہیں
ذرا کام غیرت کو فرمائیں گر ہم
تو سمجھیں کہ ہیں مبتذل کس قدر ہم

تشریح: ہم کہیں باپ دادا کی عظمت کا ڈھنگ گاتے ہیں اور اُن کا نام لے کر جیتے ہیں۔ کہیں صرف تعارف سے کام لیتے ہیں۔ کہیں جھوٹے وعدوں پر قرض لیتے ہیں اور اسی طرح دھوکے دھڑی سے ہم کام لیتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اور اپنے جن بزرگوں کے نام پر ہم فخر کرتے ہیں انہیں کے ناموں کو جگہ جگہ بیچتے پھرتے ہیں۔

پندرھواں بند:

کہیں باپ دادا کا ہیں نام لیتے — کہیں رو شناسی سے ہیں کام لیتے
کہیں جھوٹے وعدوں پہ ہیں وام لیتے — یوں ہی ہیں وہ دے دے کے دم دام لیتے
بزرگوں کے تاراج ہیں جس نام پر وہ
لئے در بدر بیچتے پھرتے ہیں وہ

تشریح: ہم وہ ہیں کہ جن کے بزرگ ایک دن حکمرانی کرتے تھے اور ایسے لائق پیر وہ حکمران تھے کہ جن کے بوڑھے جوان بھی پرستار تھے۔ ان سے بوڑھے کی حد تک محبت کرتے تھے۔ یہی ہمارے بزرگ ہی کمزور اور ناتواں لوگوں کے لیے جائے امن تھے اور یہی وہ تھے جو علم اور اصفہان جیسے مشہور شہروں کے لوگوں کے لیے مرجع تھے یعنی اس کی طرف سارے لوگ رجوع کرتے اور ہر کام میں آگے رہتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو ملک کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہتے تھے اور سچ یہ ہے کہ انہی کے گھروں میں گویا سچوں میں بادشاہت تھی۔

سولھواں بند:

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے — انہیں کے پرستار پیر و جواں تھے
یہی مامن عاجز و ناتواں تھے — یہی مرجع علم و اصفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
انہی کے گھروں میں تھی صاحب قرانی

تشریح: اور دوسری طرف ہم ہیں کہ بہت ہوا تو کوئی مسجد بنوا دی اور اس کے بانی بن گئے۔ یا بہت ہوا تو اپنے آپ کو

تشریح: ان مسلمانوں نے ارسطو جیسے فلاسفر کے علم و فن کو زندہ کر دیا اپنی بحثوں اور علم کے زور شور سے افلاطون حکیم کو گویا پھر سے زندہ کر دکھایا۔ علم، کلام اور فلسفیانہ بحثوں سے انہوں نے ہر شہر اور گاؤں کو یونان بنا دیا اور ساری دنیا کو علم و حکمت کا مزا چکھایا۔ انہوں نے ہی بتایا کہ علم کیا چیز ہے اور دانشوری کیا ہوتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے دنیا کی آنکھوں سے پردہ کر لیا یعنی رخصت ہو گئے مگر اپنے علم و فن کی مشعل سے پورے زمانے کو اس گہری نیند سے جگا دیا۔

نواں بند:

ہر اک علم و فن کے جویا ہوئے وہ   ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ   سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

تشریح: انہوں نے علم اور ہر فن کی تلاش کی محنت سے جستجو کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کام میں وہ بلند اور عظیم ٹھہرے۔ فلاحت یعنی زراعت کے علم میں انہوں نے اپنی نظیر نہیں چھوڑی۔ سیاحت یعنی سیر و سفر کا معاملہ ہوا تو اس میں بھی وہ دنیا میں مشہور ہوئے اور اپنا نشانِ امتیاز بلند رکھا۔ عمارت سازی کا فن ہو تو اس میں بھی ان کے فن کی دنیا میں دھوم مچ گئی اور یہاں تک کہ ہر قوم نے مسلمانوں سے تجارت کا فن بھی سیکھا۔

دسواں بند:

یہ تارے جو تھے مشرق میں لمعہ افگن   یہ تھا ان کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین   کتب خانہ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

تشریح: اس طرح سے یہ علم و فن کے روشن ستارے جو مشرق میں روشنی بکھیر رہے تھے ان کی اس روشنی سے مغرب تک روشن ہوا تھا۔ جن کی تحریریں اور نوشتے اب تک پیرس، روم اور لندن کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور جن سے مغرب نے استفادہ کر کے علم و فن کی روشنی کو اور چمکایا اور وہ ان کا امام بن بیٹھے لیکن افسوس ہے کہ جن بزرگوں کے علم و فن کا شور تمام ملکوں میں گونج رہا تھا وہ آج بغداد کے مقبروں میں پڑے سو رہے ہیں اور ان کو کوئی یاد بھی نہیں کر رہا ہے۔

گیارھواں بند:

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا   ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا   وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ کہتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

تشریح: وہ ملت جس کا قدم آسمان پر تھا یعنی انتہائی عروج پر تھی اور جس کا جھنڈا چاردانگ عالم میں لہرا رہا تھا اور وہ قوم جو پوری دنیا میں محترم اور قابلِ عزت تھی اور امت جس کا لقب ہی خیر الامم یعنی ساری قوموں میں سب سے اچھی قوم تھا اس کا اب دنیا میں اس قدر نشان باقی رہ گیا ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسی قوم میں اپنا شمار کرتے ہیں۔

بارھواں بند:

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے   کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے   ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

پنجم بند:

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا سے
نہ آگاہ تھے مبدا و منتہا سے
لگائی تھی اک اک نے لو ماسوا سے
پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے
یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

تشریح: اس ذات گرامی سے پہلے دنیا سزا اور جزا اور آخرت کے تصور سے واقف نہ تھی۔ لوگوں کو پتہ نہ تھا کہ ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔ ہر کام کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور دنیا کا ہر کام ایک خدا کے حکم سے ہوتا اور نہیں ہوتا ہے۔ وہ عرب اس سے بھی واقف نہ تھا کہ ہماری زندگیوں کی ابتدا کیوں کر ہوتی ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ ہر شخص نے بس ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے بہت سہاروں سے لو لگائی ہوئی تھی۔ اور اس طرح سے خدا کے بندے بہت دور ہو چکے تھے۔ مخلوق خالق کو چھوڑ کر دوسروں کو خدا بنائے ہوئے تھی۔

مگر راعی یعنی رعیت کا جو مالک تھا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے گلے یعنی اپنی قوم کو للکار کر پکارا، اس کے پیغام کی حقانیت اور سچ کی دہشت سے وہ سارے تھرا اٹھے۔ راعی اس گڈریے کو بھی کہتے ہیں جس کے ماتحت بھیڑ بکریوں کا گلہ ہوتا ہے یعنی وہ ذات گرامی جو اپنی گمراہ قوم کو صحیح راہ بتانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ جب اس نے پیغام کی حقیقت ان کے سامنے رکھی تو سارے کے سارے کانپ اٹھے۔

چھٹا بند:

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

تشریح: اس ذات گرامی نے کہا کہ صرف ایک خدا کی ذات ہی عبادت کے لائق ہے جس کی گواہی ہماری زبان بھی دے، دل بھی دے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسی کے احکام اس قابل ہیں کہ ان کو مانا جائے اور ان پر عمل کیا جائے اور اسی کی حکومت ایسی ہے جس کی خدمت کی جائے اور اے لوگو اگر تمہیں محبت کرنا ہے اور لو لگانا ہے تو اسی سے لگاؤ اور اگر کسی کو معبود بنانا ہے، کسی کے آگے سر جھکانا ہے تو صرف اسی کے آگے سر جھکاؤ۔

یہاں اب نعت سے ہٹ کر شاعر سلسلہ کلام اصل نظم یعنی اسلام کے عروج و زوال کی کہانی سے جوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس ذات گرامی کے اس پیغام حق سے جس نے فائدہ اٹھایا اس نے عظمت حاصل کی اور جو چھوڑ بیٹھا وہ اپنے اعمال کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ اگلے بند میں وہ کہتا ہے کہ

ساتواں بند:

لیے علم و فن اس سے نصرانیوں نے
کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب اس سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

تشریح: مسلمانوں سے عیسائیوں نے علم و فن سیکھا اور اسی طرح یزداں کے ماننے والوں نے اس پیغام پر لبیک کہا یعنی قبول کیا اور قبول کر کے ہر دل سے جہالت کا رشتہ توڑ کر اس کو روشن کر دیا اور پھر اس پیغام حق سے دنیا میں کوئی گھر تاریک نہ چھوڑا۔ ہر ایک کو روشن کر دیا۔

آٹھواں بند:

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا
فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا
مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانے کو خواب گراں سے

میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ آج بھی اس کے ٹکڑے لوگ پڑھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔ حالی نے اس نظم میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب و عمل کو پیش کیا ہے۔ آخر میں نئے حالات کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے اندر فکر میں تبدیلی کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ نظم علی گڑھ تحریک کی ایک نمائندہ بھی کہی جا سکتی ہے۔ نہایت سادہ، پُر تاثیر اور دلوں میں اترنے والے انداز و اسلوب میں یہ نظم لکھی گئی ہے۔ ذیل میں اس کے چند بندوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

تشریح: شاعر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کی توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ذات گرامی جس کو تمام پیغمبروں میں رحمۃ اللعالمین کا لقب ملا یعنی جو تمام انبیا میں ساری دنیا کے لیے سب سے زیادہ باعث رحمت تھا۔ سب پر یکساں مہربان تھا اور جو غریبوں کی مدد کرنے والا اور ان کی مرادوں کو پورا کرنے والا تھا۔ وہ ذات جو غیروں کو بھی مصیبت اور ان کے آڑے وقت میں کام آنے والا تھا اور لوگوں کی غم خواری میں اپنے پرائے کا فرق نہیں کرتا تھا۔ یعنی ہر ایک مصیبت زدہ کی بغیر کسی تفریق کے مدد کرتا تھا۔ ان کی دلجوئی کرتا تھا۔ ان کے غموں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں فقیروں اور بے نواؤں کی پناہ گاہ اور کمزوروں کا سہارا تھا اور بلا شک و شبہ بن ماں باپ کے بچوں کا سرپرست اور غلاموں کا مالک تھا۔

دوسرا بند:

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

تشریح: وہ گناہ گاروں کو معاف کرنے والا تھا۔ ان کی غلطیوں اور خطاؤں کو درگزر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جو اس کا برا سوچتے تھے ان کے دلوں میں ان کی محبت اور عظمت جاگ اٹھتی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ وہ فتنہ و فساد کو ختم کرنے والا تھا۔ فساد اور قتل و خون کے بہت سے اسباب اس کی محبت اور تحمل مندی کے سبب جاتے رہے اور مختلف لڑنے والے قبیلوں کو دوستی اور محبت کے رشتے میں پرونے والا تھا۔ اس نے قبائل کی دشمنیوں کو ختم کر کے ان کو اس طرح متحد کر

دیا کہ دشمنیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔

تیسرا بند:

مس خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

تشریح: یہ وہ ذات گرامی تھی جس نے کچے تانبے کو سونا بنا دیا۔ چرواہوں کو حکومت کرنے کے لائق بنا دیا۔ گرے ہوئے، کمزور اور بے سہارا لوگوں کو بلند، عظیم اور وہ سروں کا سہارا بنا دیا۔ اس نے کھوٹا الگ کر دکھایا اور بتایا کہ بڑائی نیکی میں ہے۔ کوئی شخص خاندان، قبیلے یا دولت کے سبب بڑا نہیں ہوتا۔ بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور نیک انسان ہو۔ یہ وہ ذات گرامی تھی کہ جس نے عرب جیسی قوم کی کایا پلٹ دی۔ ان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہ عرب جس پر صدیوں سے جہل اور جہالت کا سایہ تھا۔ ان کو ایسا بدلا، ایسا ذہنی اور اخلاقی انقلاب پیدا کیا کہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

چوتھا بند:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی　　اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

تشریح: اس ہادی اور رہنما کی آواز کیا تھی گویا بجلی کا کڑکا تھا جس کی آواز اور جس کے پیغام نے پورے عرب کی زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ سب کے دلوں میں ایک نئی لگن پیدا کر دی۔ ایک خدا کی اطاعت اور محبت کی لگن جس نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس ذات گرامی نے ایک آواز میں سوئی قوم کو جگا دیا۔ سوئی ہوئی عرب کی بستیاں نیند سے بیدار ہو گئیں۔ بس ہر طرف حق کے پیغام یعنی اسلام کے پیغام کا ایک شور برپا ہو گیا۔ ایسا شور حق جس کے نام سے جنگل، پہاڑ، وادیاں اور بستیاں بھی گونج اٹھیں۔

کشوروں	ملک، کشور واحد
گردوں	آسمان
کھونٹ	سمت، طرف
علم برپا ہونا	جھنڈا لہرانا
آفاق	دنیا، کائنات
خیر الامم	ساری امتوں میں اچھی امت
سلف پن	کمینہ پن
نام آبا	باپ دادا کا نام
ننگ	عزت، شرم
توقیر	عزت، وقار
دام لینا	رقم لینا
نازاں ہونا	فخر کرنا
پرستار	پوجنے والا
مامن	امن کی جگہ
عاجز و ناتواں	کمزور
مرجع	جس کی طرف سب رجوع کریں۔ ہر کام کے لیے جس کو دیکھیں۔
دیلم و اصفہان	ایران کے دو مشہور شہر
نوحہ و سوز خوانی	مرثیہ پڑھنے کے دو طریقے
بے نوا	غریب، بے زبان
اغنیا	غنی کی جمع، مالدار

نیم بسمل	زخمی، پریشان حال
گدا	فقیر، غریب
ملک بانی	بادشاہت
صاحب قرانی	بادشاہت
بانی	بنیاد رکھنے والا
خدام	خادم کی جمع، آستانوں کی خدمت کرنے والوں کو عموماً خدام کہتے ہیں۔

نظم "مسدس حالی" کی تشریح

پہلا بند:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا   وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

حوالہ: تشریح طلب بند شامل نصاب شاعر الطاف حسین حالی کی مقبول نظم "مسدس مد و جزر اسلام" سے ماخوذ ہے۔ مسدس مد و جزر اسلام حالی کی مشہور ترین نظم ہے۔ چوں کہ یہ نظم مسدس کی فارم میں ہے اس لیے اس طویل نظم کو مسدس حالی بھی کہتے ہیں۔ یہ نظم حالی نے سرسید احمد خان کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید اس نظم سے متعلق کہتے تھے کہ حشر کے دن اگر خدا نے پوچھا کہ میرے لیے دنیا سے کیا لائے ہو تو میں کہوں گا کہ حالی سے مد و جزر اسلام لکھوا کے لایا ہوں۔ اردو کی بہترین نظموں

الفاظ	معنی	مسِ خام	کچا تانبہ، کندن ہونا
ملجا	جائے پناہ، ایسا شخص جو سب کو پناہ دے	قرنوں	صدیوں
ماویٰ	پناہ گاہ، ایسا شخص جو سب کیلئے رحمت ہو	بیڑا	کشتی
خطاکار	گناہ گار، خطائیں کرنے والا	موجِ بلا	مصیبت کی موج، ایسی طوفانی موج
قبائل	قبیلے کی جمع	جو	ڈبو دے
شیر و شکر ہونا	دودھ اور چینی کا آپس میں گھل جانا۔	قضا	موت، تقدیر
	یعنی جس طرح دودھ اور چینی گھل	لو	لگن
مل کر	ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہو جانا۔	مبدا	جہاں سے ابتدا ہو۔
بجلی کا کڑکا	بجلی کی کڑک اور تڑپ	منتہا	انجام، جہاں پر ختم ہو۔
صوتِ ہادی	ہدایت کرنے والے کی آواز	اطاعت	حکم ماننا۔
گزرا	چلا	ماسوا	جو اللہ کے علاوہ ہو، اللہ کے سوا
دشت و جبل	جنگل اور پہاڑ		دوسروں کو پوجنا ماسوا کی عبادت ہے۔
حرا	وہ غار جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم	نسخہ	وہ نسخہ جو دوائی تجربہ ہو اور جس
	نبوت سے پہلے عبادت کیا		سے شفا ہوتا اور فائدہ پہنچا ہو۔ نصرانی
	کرتے تھے۔ اس غار میں حضور کو نبوت ملی		عیسائی، تین خداؤں کو ماننے والے
	اور جبرئیل فرشتے نے اللہ کا پہلا	رومانیوں	اہلِ رومانیہ
	پیغام پہنچایا یعنی پہلی آیت اتری۔	یزدانیوں	ایران کے آزاد پرست اچھائی کے دیوتا
بداندیش	بُرا سوچنے والا		کی یزداں اور برائی کے دیوتا کو اہرمن
مفاسد	بہت فساد		کہا کرتے تھے۔ یزدانیوں سے مراد یز
الفاظ	معنی		داں کے ماننے والے
زیر و زبر کرنا	تہہ و بالا کرنا، ختم کرنا	صفاہانیوں	صفاہان کے رہنے والے

پردہ کرنا	اوجھل ہونا، کنایہ ہے مر جانے سے
خوابِ گراں	گہری نیند
جویا ہونا	جستجو کرنا
بالا ہونا	بلند ہونا
فلاحت	زراعت، کھیتی باڑی
سیاحت	سیر و تفریح
مشرق	اس سے مراد مشرق ہے
مبتذل	ذلیل و خوار
روشناس	تعارف، واقفیت
دم دینا	دھوکا دینا، دام لینا
گلہ	بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، یہاں مراد قوم
راعی	گلہ بان، چرواہا، قوم کا نگراں اور جواب دہ
ذاتِ واحد	ایک ذات یعنی ایک خدا کی ذات
شہادت	گواہی
فرمان	حکم
لمعہ افگن	روشنی پھینکنے والے
مغرب	اس سے مراد مغرب یعنی یورپ کے
	لوگ ہیں
نوشتہ	تحریر
تزئین	زینت
غلغلہ	شور

مشکل الفاظ	معنی
ملجا	جائے پناہ، ایسا شخص جو سب کو پناہ دے
ماویٰ	پناہ گاہ، ایسا شخص جو سب کیلئے رحمت ہو
خطا کار	گناہ گار، خطائیں کرنے والا
قبائل	قبیلے کی جمع
شیر و شکر ہونا	دودھ اور چینی کا آپس میں گھل جانا، یعنی جس طرح دودھ اور چینی گھل
مل کر	ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہو جانا۔
بجلی کا کڑکا	بجلی کی گرج اور تڑپ
صوتِ ہادی	ہدایت کرنے والے کی آواز
بدلا	بدلہ
دشت و جبل	جنگل اور پہاڑ
حرا	وہ غار جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے عبادت کیا کرتے تھے۔ اس غار میں حضور کو نبوت ملی اور جبرئیل فرشتے نے اللہ کا پہلا پیغام پہنچایا یعنی پہلی آیت اتری۔
بد اندیش	بُرا سوچنے والا
مفاسد	فتنہ و فساد
زیر و زبر کرنا	تہہ و بالا کرنا، ختم کرنا
مسِ خام	کچا تانبہ، کندن، سونا

قرنوں	صدیاں
بیڑا	کشتی
موجِ بلا	مصیبت کی موج، ایسی طوفانی موج
جو	ڈبوئے
قضا	موت، تقدیر
لو	لگن
مبدا	جہاں سے ابتدا ہو۔
منتہا	انجام، جہاں پر ختم ہو۔
اطاعت	حکم ماننا
ماسوا	جو اللہ کے علاوہ ہو، اللہ کے سوا دوسروں کو پوجنا ماسوا کی عبادت ہے۔
نسخہ	وہ نسخہ جو انتہائی قریب ہو اور جس سے شفا ہونا اور فائدہ پہنچتا ہو۔ نصرانی عیسائی، تین خداؤں کو ماننے والے
رومانیوں	اہلِ روما یک
یزدانیوں	ایران کے آتش پرست اچھائی کے دیوتا کو یزداں اور بُرائی کے دیوتا کو اہرمن کہا کرتے تھے۔ یزدانیوں سے مُراد یزداں کے ماننے والے
صفاہانیوں	صفاہان کے رہنے والے
افلاطون و ارسطو	مشہور یونانی حکیم اور فلاسفر
قریہ	قصبہ یا گاؤں

اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیمبر — کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر

برادر ہے جب تک برادر کا یاور — معین اُس کا ہے خود خدا وند داور

تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی

فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

وہ گھر جس میں دل ہوں ملے سب کے باہم — خوشی ہو خوشی میں ہوں سب یار ہمدم

اگر ایک خوش دل تو گھر سارا خرم — اگر ایک غم گیں تو دل سب کے پُرغم

مبارک ہے اس قصرِ شاہنشہی سے

جہاں ایک دل ہو مکدر کسی سے

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے — پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے

نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے — کوئی ان میں سوتا، کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مستِ خوابِ گراں ہیں

جو بیدار ہیں اُن پہ خندہ زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو — کس اُمید پہ تم کھڑے ہنس رہے ہو

بُرا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو — نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے

اگر ناؤ ڈوبی، تو ڈوبیں گے سارے

کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا — کہ نعمت ہے دُنیا میں سب سے بڑی کیا؟

کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا" — کہا "گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرہ؟"

کہا "پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے"

"کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے"

کہا "گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر؟" — کہا "مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر"

کہا "وہ ہو یہ بھی اگر بند اس پر؟" — کہا "اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"

وہ ننگِ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے

خلائق سب اُس کی نحوست سے چھوٹے

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو! — مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو

گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو — تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو

وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر

کہ ہونے سے اُن کا نہ ہونا ہے بہتر

رہو گے یونہی فارغ البال کب تک؟ — نہ بدلو گے یہ چال اور ڈھال کب تک؟

رہے گی یہ قوم ایسی پامال کب تک؟ — نہ چھوڑو گے تم بھیڑیا چال کب تک؟

بس اگلے فسانے فراموش کر دو!

تعصب کے شعلے کو خاموش کر دو!

☆☆☆

کہیں باپ دادا کا ہیں نام لیتے — کہیں رو شناسی سے ہیں کام لیتے
کہیں جھوٹے وعدوں پہ ہیں دام لیتے — یوں ہی ہیں وہ دے دے کے دم دام لیتے

بزرگوں کے نازاں ہیں جس نام پر وہ
اُسے در بدر بیچتے پھرتے ہیں وہ

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے — انہیں کے پرستار پیر و جواں تھے
یہی مامن عاجز و ناتواں تھے — یہی مرجع و ملجا و اصفہاں تھے

یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
انہی کے گھروں میں تھی صاحب قرانی

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی — بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت سیکھ کے کچھ نوحہ و سوز خوانی — بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی

بہت آستانوں کے خدام بن کر
بہت مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

عمل جن کا ہے اس کلام متیں پر — وہ سرسبز ہیں آج روئے زمیں پر
تفوق ہے جن کو کہیں و مکیں پر — مدار آدمیت کا ہے انہیں پر

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

امیروں کی دولت غریبوں کی ہمت — ادیبوں کی انشا، حکیموں کی حکمت
منچلوں کے شغلے شجاعوں کی جرأت — سپاہی کے ہتھیار، شاہوں کی طاقت

دلوں کی امیدیں، امنگوں کی خوشیاں
سب اہل وطن اور وطن پہ ہیں قرباں

نبی ہم میں ہیں جو کہ ارباب ہمت — مسلّم ہے عالم میں جن کی سخاوت
اگر ہے مشائخ سے ان کو عقیدت — تو ہے پیرزادوں پہ وقف ان کی دولت

لگے ہیں دن رات واں عیش کرنے
یہ نوکر ہیں جتنے وہ ہیں بھوکے مرتے

وہ علم شریعت کے ماہر کدھر ہیں؟ — وہ اخبار دیں کے مبصر کدھر ہیں؟
اصولی کدھر ہیں؟ مناظر کدھر ہیں؟ — محدث کہاں ہیں؟ مفسر کدھر ہیں؟

وہ مجلس جو کل سر بہ سر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے — مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب اک اک کے باہم مددگار ہوتے — عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے

جب الفت میں ہوتے یوں ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم ہم

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا سے
نہ آگاہ تھے مبدا و منتہا سے
لگائی تھی اک اک نے لو ماسوا سے
پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلّہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ

لیے علم و فن اُس سے نصرانیوں نے
کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے
ادب اُس سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا
فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا
مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

ہر اک علم و فن کے جویا ہوئے وہ
ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ
سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

یہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن
یہ تھا ان کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین
کتب خانہ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

وہ ملت کے گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ اُمت لقب جس کا خیر الامم تھا

نشاں اُس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ کہتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے
کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے
ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں
ہزار اُن میں خوبی ہیں، تو وہ بے نوا ہیں
یہاں لاکھوں میں وہ اگر اغنیا ہیں
تو سو ہم میں بھولے ہیں، باقی گدا ہیں

ذرا کام غیرت کو فرمائیں گر ہم
تو سمجھیں کہ ہیں مبتذل کس قدر ہم

تشریح: اس بند میں شاعر دعا گو ہے کہ اس دنیا میں بادشاہ سے لے کر فقیر تک خدا کسی کو مفلس نہ بنائے اور مفلسی میں مبتلا نہ کرے۔ کیونکہ مفلسی ایک ایسی لعنت ہے جو اشرف و عالی اوصاف والے شخص کو ایک آن میں حقیر بنا دیتی ہے۔ نظیر فرماتے ہیں کہ مفلس کی بے شمار خرابیاں ہیں میں کون کون سی برائی بیان کروں۔ مفلس کے درد کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے مفلسی کو برداشت کیا ہو یعنی سوائے مفلس کے مفلسی کی کربناکیوں کو کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی برائیوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

☆☆☆

اکائی: ۳

الطاف حسین حالی

نظم "انتخاب مسدس مد و جزر اسلام"

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی　　اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

اُس کے اپنے دوست، عزیز اور رشتے دار اُس کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مفلسی کی وجہ سے وہ ہر کسی کی نظر میں گر جاتا ہے۔

ساتواں بند:

کیسا ہی آدمی ہو؟ پر افلاس کی طفیل　　　کوئی گدھا کہے، اُسے ٹھہرا دے کوئی بَیل

کپڑے پھٹے تمام، بڑھے بال پھیل پھیل　　　منھ خشک، دانت زرد، بدن پر جما ہے میل

سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو غریبی کی بدولت اُس کی ساری عزت اور شان و شوکت جاتی رہتی ہے۔ وہ حالت کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ کوئی اُسے گدھا کہتا ہے تو کوئی اُسے بَیل گردانتا ہے۔ غرض سب اُسے نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مفلس کا لباس پھٹا ہوا ہوتا ہے سر کے بال بڑھے ہوئے ہیں جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوتے ہیں۔ اُس کا منہ خشک ہوتا ہے اور دانتوں پر میل جمنے کے سبب وہ زرد پڑ چکے ہوتے ہیں جسم پر بھی میل جمی ہوئی ہوتی ہے۔ اُس کی شکل بالکل قیدیوں کے جیسی بن چکی ہوتی ہے۔ اس طرح مفلسی آدمی کو آسمان سے زمین پر گرا دیتی ہے اور اُس کی ساری عزت اور شان و شوکت مٹی میں مل جاتی ہے۔ اور سماج میں وہ بے عزت و آبرو ہو کے رہ جاتا ہے۔

آٹھواں بند:

ہر آن، دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے　　　جو آشنا ہیں، اُن کی تو اُلفت گھٹاتی ہے

اپنے کی مہر، غیر کی چاہت گھٹاتی ہے　　　شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے

ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی غریب ہو جاتا ہے تو اُس دوست اور عزیز اُس سے محبت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اُس کے آشنا رشتے دار بھی اُس سے چاہت نہیں رکھتے۔ جب اپنوں کی محبت اور ہمدردی کم ہو جاتی ہے تو غیر بھی اُس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مفلس انسان کی شرم و حیا اور عزت و احترام بھی کم ہو جاتا ہے۔ ہاں اُس کے ناخن اور بال ضرور بڑھ جاتے ہیں جو کہ مفلس ہونے کا ثبوت ہیں۔

نواں بند:

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی　　　وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی

کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی　　　تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی

مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

تشریح: مذکورہ بند میں نظیر فرماتے ہیں کہ مفلسی میں آدمی کی شرافت، نجابت، بزرگی اور ذات کی قدر سب ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کے سارے اوصاف افلاس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مفلس کا پہنا ہوا لباس بھی اس کی عزت و احترام کو ختم کر دیتا ہے۔ مفلس آدمی کی سماج میں کوئی تعظیم و تکریم نہیں کرتا اُس کی ساری عزت و توقیر خاک میں مل جاتی ہے۔ اگر وہ کسی مجلس میں چلا جائے تو بیٹھنے کے لئے جوتیوں پر مقام ملتا ہے۔ غرض مفلسی انسان کو اتنا گرا دیتی ہے کہ وہ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دسواں بند:

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اُٹھا　　　باپ اُس کا دیکھے ہاتھ کا اور پانو کا کڑا

کہتا ہے کوئی، جوتی نہ لیوے کہیں چُرا　　　نٹ کھٹ، اُچکا، چور، دغاباز، گٹھ کٹا

سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مفلس کسی امیر کے لڑکے کو پیار سے اُٹھا لیتا ہے تو اُس کا باپ اُس غریب پر کڑی نظر رکھتا ہے کہ کہیں لڑکے کے ہاتھ اور پانو کے کڑے نہ اُتار کے لے جائے۔ غرض لوگ اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں کوئی اُسے چور اچکا کہتا ہے تو کوئی دھوکے باز، فریبی اور جیب کترا کہہ کے پکارتا ہے۔ گویا غریب آدمی پر سو طرح کے الزام لگواتی ہے۔

گیارہواں بند:

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو! تا فقیر　　　خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر

اشرف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر　　　کیا کیا؟ میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر

وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

دوسرا بند:

جو اہلِ فضل، عالم و فاضل کہلاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ فضل، عالم اور فاضل سمجھتے ہیں اور سماج میں بھی فاضل کہلاتے ہیں اور ایک خاص مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ جب کبھی افلاس و ناداری میں مبتلا ہوتے ہیں تو کلمہ پڑھنا بھی بھول جاتے ہیں۔ مفلسی ان کے شعور و نفسیات کو اس حد تک متاثر کر دیتی ہے کہ وہ الف کے جواب میں بے بتاتے ہیں یعنی پوچھو کچھ اور جواب کچھ اور دیتے ہیں ایسے ہی عالم پہلے غریب اور غربا کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے لیکن جب خود مفلسی کے شکار ہوئے تو سب کچھ بھول گئے۔ پھر غریبی و پسماندگی عمر بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔

تیسرا بند:

مفلسی کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ غریبی آدمی کو اس حد تک نیچے گرا دیتی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کا بھی خیال نہیں کرتا۔ بھوکے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ روٹی کا خوان دیکھ کر اس پر ایسے ٹوٹ پڑتا ہے جیسے کتے ہڈی پر۔ جہاں شاعر نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مفلس کی حالت کتے سے بھی بدتر ہو جاتی ہے وہ روٹی کے ٹکڑے پر ایسے لڑتے ہیں جیسے کتے استخوان پر لڑتے ہیں۔

چوتھا بند:

بی بی کی نتھ، نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے
کپڑے میاں کے بنیے کے ہاتھوں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں پڑے رہے
زنجیر، نہ کواڑ، نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ ناداری کے عالم میں آدمی اپنی ہر چیز کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ بھوکے پیٹ کی خاطر بی بی کی نتھ اور لڑکوں کے ہاتھوں کے کڑے بھی بک جاتے ہیں۔ یہاں میاں کے کپڑے بنیے کے پاس گروی پڑے رہتے ہیں یہاں تک کہ مکان کی کڑیاں، زنجیر، کواڑ اور پتھر تک بھی غریبی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یعنی مکان کی ایک ایک اینٹ بک جاتی ہے اور وہ گھر سے بے گھر ہو جاتا ہے۔ غرض تنگ دستی آدمی کے تمام سہارے چھین کر اس کو بے سہارا کر دیتی ہے۔

پانچواں بند:

بیٹے کا بیاہ ہو تو بیاہی نہ ساتی ہے
نے روشنی، نہ باجے کی آواز آتی ہے
ماں پیچھے ایک میلی چادر اوڑھے جاتی ہے
بیٹا بنا ہے، دولہا، تو باوا براتی ہے
مفلس کی یہ برات چڑھاتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ مفلسی خوشی کے لمحات کو بھی محرومی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اگر کبھی غریب آدمی کے بیٹے کی شادی ہو تو کوئی اس کی شادی میں مہمان نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ساتھی و مددگار ہوتا ہے۔ غریب آدمی کی شادی میں کوئی شان و شوکت نہیں ہوتی نہ باجے بجتے ہیں نہ روشنیوں کا اہتمام ہوتا ہے اور نہ ناچ گانا۔ تنگ دست آدمی کے بیٹے کی برات میں بھی کوئی نہیں جاتا۔ صرف اس کی ماں ایک میلی چادر اوڑھے اس کے پیچھے چلتی ہے اور اس کا باپ براتی بنتا ہے۔ بس ایک غریب آدمی کے بیٹے کی شادی کا یہی حال ہوتا ہے۔

چھٹا بند:

مفلس کا درد، دل میں کوئی ٹھانتا نہیں
مفلس کی بات کو، تو کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی، اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

تشریح: اس بند میں شاعر اس تلخ حقیقت کا بیان کرتا ہے کہ غریب آدمی کے دکھ درد کا احساس کسی کے دل میں نہیں ہوتا۔ اس کی پریشانی کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا اور نہ ہی اس کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ مفلس کی ذات اور اس کا حسب و نسب کوئی بھی نہیں جانتا غرض اس کے سارے رشتے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بیٹے کا بیاہ ہو تو بیاہی نہ ساتھی ہے
نے روشنی نہ باجے کی آواز آتی ہے
ماں پیچھے ایک میلی چادر اوڑھے جاتی ہے
بیٹا بنا ہے دولہا تو باوا براتی ہے
مفلس کی یہ برات چڑھاتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں
مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کی طفیل
کوئی گدھا کہے اسے ٹھہرا دے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل
منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے
جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنے کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے
شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے
جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنے کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے
شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اٹھا
باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوتی نہ لیوے کہیں چرا
نٹ کھٹ اچکا چور دغاباز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

تعارف: نظیر اکبرآبادی نے بہت سے ایسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جو دوسرے شعرا کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ جیسے آٹے دال کا بیان، تل کے لڈو، دیپا اور روٹیاں وغیرہ۔ لیکن نظیر کی نظر میں یہ بڑے اہم موضوع ہیں چونکہ ان میں نظیر کو عوامی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مفلسی بھی ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے جو ہمارے دماغ پر عجیب و غریب اثر ڈالتی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نظیر نے کسی مفلس کی صحبت میں رہ کر ایک حساس شاعر کی طرح ان کی کے تصادمات کو محسوس کیا ہو۔ مفلسی میں انسان کی ساری عزت و شان خاک میں مل جاتی ہے۔ مفلسی انسانی زندگی کو کس طرح متاثر کرتی ہے اس کا نقشہ نظیر نے اس نظم میں بڑے فطری انداز میں کھینچا ہے۔

پہلا بند:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

تشریح: مذکورہ بند نظیر اکبرآبادی کی نظم مفلسی سے لیا گیا ہے۔ مفلسی نظیر کی ایک اہم نظم ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مفلسی یعنی غریبی انسان کو کس کس طرح سے متاثر کرتی ہے۔ اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ جب آدمی کی زندگی میں غریبی اور ناداری آتی ہے تو اس کی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ وہ طرح طرح کی مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کو کئی کئی دن بھوکا رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو پانی بھی میسر نہیں ہوتا۔ مفلس کا درد وہی سمجھتا ہے جس نے اس دکھ کو کبھی محسوس کیا ہے یعنی جو غریبی اور ناداری کا شکار ہوا ہو۔ امیر آدمی کو مفلسی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ عیش و عشرت سے زندگی گذارتا ہے۔

لے رہا ہے یعنی خرید رہا ہے۔

چھٹا بند:

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے ورق میں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کم خواب، تاش، شال، دو شالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: اس بند میں شاعر دولت مند اور مفلس کا فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رئیس اور دولت مند بھی آدمی ہے جو سونے اور چاندی کے ڈھیر پر قبضہ جما کر بیٹھا ہوا ہے اور زندگی کے سارے عیش و آرام حاصل کر رہا ہے دوسری جانب ایک آدمی ایسا بھی ہے جو پیسے پیسے کے لئے محتاج ہے اور چیتھڑوں میں لگ کر زندگی گزار رہا ہے اور غریبی و لاچاری اس کا مقدر ہے۔

ساتواں بند:

اشرف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر　　یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر　　اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب سے جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: اس بند میں نظیر فرماتے ہیں کہ اشرف سے لے کر کمینے تک اور بادشاہ سے لے کر وزیر تک ہر کوئی آدمی ہی ہے۔ دنیا میں اچھے کام بھی آدمی ہی کرتا ہے۔ جو مرید بنے ہیں وہ بھی آدمی ہیں اور جو پیر کہلاتے ہیں وہ بھی آدمی یعنی آقا بھی آدمی ہے اور غلام بھی آدمی۔ دنیا میں جو نیک نیتی سے کام کرتا ہے اور سب سے اچھا کہلاتا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو سب سے برا ہے وہ بھی آدمی یعنی آدمی ہی فرشتہ ہے اور آدمی ہی شیطان۔

اکائی: ۲

نظیر اکبر آبادی

نظم "مفلسی"

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی　　بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہل فضل، عالم و فاضل کہلاتے ہیں　　مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں　　وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلسی کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر　　دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر　　جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

بی بی کی نتھ، نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے　　کپڑے میاں کے بنیے کے ہاتھوں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں پڑے رہے　　زنجیر، نہ کواڑ، نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

حوالہ تشریح طلب بند شامل نصاب شاعر نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی نامہ" سے ماخوذ ہے۔ جس میں انسانی شخصیتوں کے مختلف رنگوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔

تشریح: اس بند میں نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں یہاں آدمی ہی حکمران اور بادشاہ ہے جو دوسروں پر حکومت کرتا ہے اور بہت مال دار ہے۔ وہ قدرت کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہیں آدمی ہی مفلس اور غریب ہے جو پوری زندگی تنگ دستی اور بے سرو سامانی کی حالت میں گذارتے پر مجبور ہے وہ غریب پسماندہ روٹی کے ٹکڑوں کے لیے محتاج ہے۔ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک طرف آدمی کے حصے میں دنیا کی تمام آسائش آتی ہیں تو دوسری جانب زمانے کے سارے رنج و آلام اس کا مقدر بنتے ہیں۔

دوسرا بند:

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور   یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور   شیطان بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی و رہنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: دوسرے بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا میں آدمی ہی نار یعنی ظلمت ہے اور آدمی ہی نور یعنی روشنی۔ یعنی دنیا میں آدمی ہی ظلمت و تاریکی کا باعث بنتا ہے اور غیر اخلاقی ارتکاب انجام دیتا ہے۔ اور وہ بھی آدمی ہی ہے جو نیک اعمال کی بدولت اس دنیا کو حسین و مکمل بنانے میں کوشاں رہتا ہے اور سراپا روشن ضمیر اور وفاداری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ گویا دنیا میں آدمی ہی فرشتہ ہے اور آدمی ہی شیطان۔ یعنی جو کار خیر کرتا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو کار بد وہ بھی آدمی۔ جو سماج اور معاشرے کو گمراہ کرتا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو عوام کو بھلائی کا راستہ دکھا کر اس کی رہنمائی کرتا ہے وہ بھی آدمی۔

تیسرا بند:

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں   اور آدمی ہی، ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: تیسرے بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا میں مندر، مسجد اور گرجا آدمی نے ہی بنائے ہیں اور ان میں پجاری، امام اور پادری بھی آدمی ہی ہیں۔ جو ان میں پوجا، نماز اور قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ بھی آدمی ہیں اور جو نمازیوں کی جوتیاں چرا کے بھاگ نکلتا ہے وہ بھی ہی ہے۔ اور جو جوتیاں چرانے والوں پر نظر رکھتا اور انھیں ڈانٹتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ یعنی نیکی کی راہ پر چلنے والا بھی آدمی ہے اور کار بد کو انجام دینے والا بھی آدمی۔

چوتھا بند:

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی   اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی   چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: چوتھے بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو حق اور محبت کے راستے پر چلتے ہوئے ایک دوسرے پر جان قربان کر دیتے ہیں اور ایسے بھی آدمی ہیں جو تلواروں سے آدمی کا گلا کاٹتے ہیں اور انسانیت کے قاتل قرار پاتے ہیں۔ آدمی ہی آدمی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے، یہاں مصیبت کے وقت آدمی ہی آدمی کو چلا کے پکارتا ہے اور جو سن کر اس کی حفاظت کے لیے دوڑ آتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ غرض یہاں آدمی ہی جاں نثار اور آدمی ہی جان گسل۔ آدمی دوسروں کی عزت بچانے والا بھی ہے اور عزت سے کھلواڑ کرنے والا بھی۔

پانچواں بند:

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا   اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا   کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تشریح: اس بند میں شاعر تجارت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بڑے سے بڑے پیمانے پر تجارت کرنے والا تاجر بھی آدمی ہے اور سر پہ خوانچا یا چھابڑا لیے دن بھر گلی گلی گھومنے والا بھی آدمی ہے۔ بیوپار میں مکاری، دھوکہ یا فریب کرنے والا بھی آدمی ہے اور وہ بھی آدمی جو تجارت دیانت داری اور ایمان داری سے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ آدمی ہی ہے جو مختلف قسم کی چیزیں بنا بنا کر بیچ رہا ہے اور دوسری جانب وہ بھی آدمی ہے جو ان چیزوں کو مول

اکائی: 1

نظیرؔ اکبرآبادی

نظم "آدمی نامہ"

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور — یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور — شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں — اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی — اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی — چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا — اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا — کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں — روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے ورق میں
جھکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کم خواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشرف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ
اور سب سے جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تعارف: اردو غزل میں جو مقام میر تقی میرؔ اور قصیدے میں محمد رفیع سوداؔ کو حاصل ہے وہی مقام اردو نظم میں نظیرؔ اکبرآبادی کو حاصل ہے۔ نظیرؔ اردو شاعری میں ایک عوامی شاعر کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے عوام اور عوامی موضوعات پر عوامی لہجے میں بڑی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ وہ زمین سے جڑے ہوئے شاعر ہیں اور انھوں نے روز مرہ کی زندگی کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیرؔ کی مشہور و مقبول نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسان کے مختلف رنگوں اور مشاغل کو بیان کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ رنگ و نسل، مذہب و ملت اور اعلیٰ و ادنیٰ کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان فرق پیدا کرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر ہر شخص آدمی ہونے کے ناتے، مساوی حقوق کا مستحق ہے۔ "آدمی نامہ" نظیرؔ کی انسان دوستی اور عوام پرستی کا واضح ثبوت ہے۔ آدمی نامہ میں شاعر نے خالص بیانیہ انداز میں طرح طرح سے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "اشرف اور کمینے سے لے کر شاہ تا وزیر" ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی شخص کا سوا ہے۔

نظم "آدمی نامہ" کی تشریح

پہلا بند:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فہرست

اکائی:۱	آدمی نامہ از نظیر اکبر آبادی	04
اکائی:۲	مفلسی از نظیر اکبر آبادی	09
اکائی:۳	انتخاب مسدس از الطاف حسین حالی	17
اکائی:۴	برکھا رت از خواجہ الطاف حسین حالی	39
اکائی:۵	مدرسہ علی گڑھ از اکبر الٰہ آبادی	65
اکائی:۶	مدرسہ علی گڑھ اور مستقبل	72
اکائی:۷	مادر وطن از سرور جہاں آبادی	79
اکائی:۸	"گنگا" از سرور جہاں آبادی	85
اکائی:۹	رامائن کا ایک سین از چکبست	92
اکائی:۱۰	"ایک آرزو" از محمد اقبال	112
اکائی:۱۱	"نیا شوالہ" از اقبال	116
اکائی:۱۲	نثار میں تیری گلیوں پہ	118
اکائی:۱۳	صبح آزادی	121
اکائی:۱۴	اردو نظم اور شامل نصاب نظم نگار شعرا کے حالات زندگی	126
اکائی:۱۵	شامل نصاب نظم نگار شعرا کے حالات زندگی اور نظم نگاری	129
اکائی:۱۶	حالی	131
اکائی:۱۷	اکبر الٰہ آبادی کی حیات اور ادبی خدمات	134
اکائی:۱۸	درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی نظم نگاری	142

اکائی:۱۹	چکبست بحیثیت نظم گو	145
اکائی:۲۰	اقبال بحیثیت نظم گو	147
اکائی:۲۱	فیض احمد فیض بحیثیت نظم گو	151
اکائی:۲۲	تنقیدی سوالات	155
اکائی:۲۳	جموں و کشمیر میں اردو زبان کا آغاز و ارتقا	185
اکائی:۲۴	مصنفین	195

☆☆☆

book.

Thus thesplitting of questions & Marks will be as under:

Unit	Q. to be given	Q. to be attempted	Marks
I.	4	2	10+10=20
II.	2	1	16
III.	2	1	16
IV.	2	1	16
V.	12 (obj.)	12	12
		Total =	80 Marks

Note: 20 marks reserved for internal Assessment shall be distributed as under:

1. Class Test : 10 marks
2. Two Written Assignment : 10 marks (05 marks each)

Books prescribed :

1. Jadeed Urdu Nisab (HissaAwwal) Published by Qasmi Kutab Khana, Jammu, year 2014
2. Intekhab-e-Manzumat, Hissa Awwal by U.P. Urdu Academy. Year 1984 -
3. Riyasat Jammu-o-Kashmir Mein Urdu Mazi, Haal Mustaqbal by Dr. Shohab Inayat Malik
4. جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی

Books Recommended:

1.	مختصر تاریخ ادب اردو	از ڈاکٹر اعجاز حسین
2.	داستان تاریخ اردو	از حامد حسن قادری
3.	تاریخ ادب اردو	از رام بابو سکسینہ
4.	مقدمہ تاریخ زبان اردو	از مسعود حسین
5.	تاریخ ادب اردو	از نورالحسن نقوی

7. **Faiz:** Nisar Main Teri Galion Pe and Subh-e-Aazadi — فیض احمد فیض: نثار میں تری گلیوں پہ، صبح آزادی

Unit-II **16 Marks**

Critical questions on the following :

1. Definition and characteristics of Urdu Nazm.
2. The art ofthe Poets prescribed for Unit-I (One at a time).
3. Life and works of the Poets Prescribed (One at a time).
4. Critical appreciation of any poem prescribed.
5. Patriotism in the poetry of prescribed poets.

Unit - III **16 Marks**

(Urdu Language)

1. Origin and developmentof Urdu Language.
2. Importance and future of Urdu language in J&K.

Unit-IV **16 Marks**

(Essay Writing)

Any General / Literary Topic.

Unit-V **12 Marks**

(Objective Type Questions)

This unit will be based on objective type questionswith multiple choice of three given options (one correct)Question will be taken from Unit-I, II & III prescribed forthis paper in a balanced manner to judge the intellectual abilities, under standing of the course and skills of the students.

Note for paper setting :

The question paper will have four questions in Unit-I dealingwith explanation with special reference to thecontext, the candidate would be required to attempt twoquestions. Two questions will be set from Unit-II, I II asking the candidates to attempt one question from each unit, for tUnit-IV four topics on General/Literary topics will begiven and the candidates would be required to Write a detailed Essayon any one of the topics. Unit-V will be of objective type in nature based on 12 questions with three options (oneofthem correct), the candidates would be required to write all the correct answers in their answer

SYLLABUS

Course No.: UR-201
Duration of Exam. : 3 Hrs

Title: Urdu
Total Marks: 100
Theory Examination: 80
Internal Assessment: 20

General Information :
This course shall be divided intdive units Unit-I will be based on poems for detailed study dealing with explanation with reference to context. This unit will have 4 questions.The candidates would be required to attempt 2 questions of 10 marks each. Unit-II & III will have 2 questions and unit-IV will have 4 General/literary topics and candidates would be required to attempt only one out of four topics Unit-V willhave 12 objectives type questions with three options each.These questions will be based on the syllabi forunit-I, II & III of this paper.

The detail of syllabi will be as below.

Unit-I : (Nazm) — 20 Marks

Detailed study of the followings :

1. **Nazir:** Aadami Nama and Muflasi
2. **Hali:** Intakhab-e-Musaddas Mado-Jazar-Islam and Barkha Rut
3. **Akbar:** Madrassa-e-Aligarh and Mustaqbal
4. **Saroor:** Madar-i-Watan and Ganga
5. **Chakbast:** Ramayan ka ek Sein and Phool Mala
6. **Iqbal:** Ek Arzoo and Naya Shiwala

نظیر اکبرآبادی:
آدمی نامہ اور مفلسی
الطاف حسین حالی:
انتخاب مسدس مدوجزر اسلام اور برکھا رت
اکبر الہ آبادی:
مدرسہ علی گڑھ اور مستقبل
درگا سہائے سرور جہان آبادی:
مادرِ وطن اور گنگا
پنڈت برج نارائن چکبست:
رامائن کا ایک سین اور پھول مالا
ڈاکٹر محمد اقبال:
ایک آرزو اور نیا شوالہ

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

۱۔ پروفیسر سکھ چین سنگھ
(شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی)

۲۔ پروفیسر وجے دیو سنگھ
(ڈی ڈی ای، جموں یونیورسٹی)

۳۔ ڈاکٹر اشوک کمار
(لیکچرر، شعبہ اردو، ڈی ڈی ای، جموں یونیورسٹی)

۴۔ ڈاکٹر مول چند
(گورنمنٹ ڈگری کالج، پلورہ، جموں)

پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ : لیاقت علی
(لیکچرر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

مزید معلومات کے لیے دیکھیں https://www.distanceeducationju.in

ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموں، جموں

474

کلاس: بی۔اے، سمسٹر دوم

کورس نمبر:UR-201 سمسٹر دوم

مضمون: اُردو اکائی:1-24

ڈاکٹر نیلم چودھری

کورس کوآرڈی نیٹر

(c) جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں جموں یونیورسٹی کی تحریری
اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF LEARNING MATERIAL

B.A. SEMSTER -II

SUBJECT : URDU LESSON : 1-24

COURSE NO.: UR-201

Dr. Neelam Choudhary
Course Co-coordinator

---

http://www.distanceeducationju.in

Printed and Published on behalf of the Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu by the Director, DDE University of Jammu, Jammu